انتساب

زینو کے نام

صبح قیامت ایک دُم گرگ تھی اسدؔ
جس دشت میں وہ شوخ دو عالم شکار تھا

اسداللہ خاں غالبؔ

قاری کی پیدائش اُس وقت ہوتی ہے جب مصنف کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

رولاں بارت

یہ قطعی ضروری نہیں کہ سب آسان ہو۔ زندگی میں ایسی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں
جن کو بغیر سمجھے ہی ہم اُن سے لطف حاصل کرتے ہیں مثلاً سیکس۔

ایلن شاپرو

نوحہ گری بھی کبھی کبھی بے حد خوش آئیند واقعات کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

اتالو کیلوینُو

انسانوں کے ذریعے کیے گئے تمام کام غیر متجانس، غیر مطابق، غیر موزوں اور بے موقع ہوتے ہیں۔ چاہے وہ شاعر اور ادیب ہوں یا قواعد دان۔

ہرمین بروخ

چھند سے خالی کوئی شبد نہیں ہوتا اور نہ ہی شبدوں سے خالی کوئی چھند۔

ناٹیہ شالتر

یہ یقیناً موت کی تیسری کتاب ہے۔ جس کو حاضرِ خدمت کرتے ہوئے میں بس دو یا
تین باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ میری تمام گذشتہ تحریروں کی طرح اس
کتاب میں بھی وہی خرابیاں موجود ہیں جن کا کافی شہرہ رہا ہے بلکہ ممکن ہے کہ اس بار پہلے
سے کچھ زیادہ ہی ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ زبان کا ایک کام اشیاء کی نمائندگی کرنا ضرور
ہے۔ مگر کسی بھی تخلیقی بیانیے میں الفاظ محض خارجی یا داخلی حقیقت کی نمائندگی نہیں کرتے۔
ورنہ اِس طرح تو ہر آرٹ ایک ثانوی درجے کی شے بن کر رہ جائے گا یعنی نمائندگی کرنے کا
محض ایک وسیلہ، تخلیقی زبان میں لفظ آپس میں مل کر جو بیانیہ خلق کرتے ہیں۔ اُسے اپنے
آپ میں ایک مکمل اور سالم دنیا ہونا چاہیے۔ خود مکتفی اور مقصود بالذات حقیقت۔ میرے
لیے پریشانی کا سبب یہی ہے کیونکہ انسانوں کے الفاظ پرچھائیوں کی طرح ہوتے ہیں اور
پرچھائیاں روشنی کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں سمجھا سکتیں۔ روشنی اور پرچھائیں کے درمیان
ایک دھندلی سطح ہوتی ہے جہاں سے لفظ پیدا ہوتے ہیں۔ زبان کی یہ دو سرحدیں جہاں ملتی
ہیں وہاں کھینچی گئی ایک لکیر پر میری تحریر اکیلی اور بے یار و مددگار بھٹکتی رہتی ہے۔ اپنے معنی کی
تلاش میں جو زبان کے اس دومنھ والے پُراسرار سانپ جیسے رویّے کی وجہ سے کبھی ایک
مقام پر نہیں ٹھہرتے۔ ممکن ہے کہ اس کتاب میں یہ مسئلہ زیادہ گمبھیر ہو۔ تیسری اور آخری
بات یہ کہ یہاں اُردو کی مستند لغات، قواعد، صرف ونحو اور اوقاف سے انحراف تو نہیں کیا گیا
ہے مگر ہر جگہ بہت سختی سے پابند بھی نہیں رہا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ کتاب دراصل بہتے
ہوئے وقت اور پانی کی کتاب ہے۔

خالد جاوید

عادت ہمیں فرصت فراہم کرتی ہے اور ہم محفوظ ہو جاتے ہیں۔ عادت ہمیں
حسّاس نہیں رہنے دیتی۔ عادت حساسیت کی دشمن ہے۔

جے کرشنا مورتی

کسی بھی فن پارے کو سمجھنے سے زیادہ اُس کو محسوس کرنا چاہیے۔ جہاں تک سمجھنے کی بات ہے ہم ریاضی کے ایک سوال تک کو نہیں سمجھتے ہیں۔ اور نہ ہی محسوس کرتے ہیں۔ ہم وہاں کچھ پہلے سے فرض کر لیتے ہیں۔ اور پھر سوال حل کرنے کی مشق کرتے رہتے ہیں۔ پھر یہ مشق ہماری عادت بن جاتی ہے۔ ہم ہر مسئلے سے عادتاً گزرنا سیکھ جاتے ہیں۔

برگمین

تو اِس طرح دنیا ختم ہو جائے گی۔ دھماکے کے ساتھ نہیں بلکہ ایک کمزور سی سِسکی کے ساتھ۔

ٹی. ایس. ایلیٹ

صبح کے ٹھیک آٹھ بجے سرہانے لگے ہوئے الارم نے اُسے جگا دیا۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ وہ آنکھیں مَلتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی کے شیشے سے پردہ سرکایا۔ باہر وہی پیلا پیلا سا دُھند تھا۔ تین دِن پیشتر ایک دھول بھری، پیلی آندھی آئی تھی مگر پھر یہیں آ کر رُک گئی، آگے نہیں گئی۔ اب ہوا بالکل بند تھی مگر آندھی کا غبار ٹھہرا رہا۔ اگر بارش ہو جاتی تو یہ غبار دُھل جاتا مگر بارش کا دور تک پتہ نہ تھا۔ کچھ چیزیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ وہ ایک جگہ پہنچ کر رُک جاتی ہیں، وہ جن پہیوں پر سفر کرتی ہیں وہ جام ہو جاتے ہیں۔

یہ بڑا منحوس موسم ہوتا ہے، بڑا حبس پیدا کرتا ہے۔ اُس نے کہا۔ ہر موسم خراب ہوتا ہے۔ اُس کی بیوی اُکتا کر بولی۔ وہ کمرے سے نکل کر سیدھا ٹوائیلٹ میں چلا گیا۔ آٹھ منٹ بعد، ٹھیک آٹھ منٹ بعد اُس نے فلش کی زنجیر کھینچی۔ پانی کے ریلے کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ناقابل برداشت بدبو کا ریلا بھی آیا۔ اُس نے گھبرا کر ناک بند کر لی۔ پھر نالی بند ہو گئی۔ اس نے سوچا، سڑاندھ ہی سڑاندھ ہے۔ اُس کے سر کے درد میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ باہر آیا، واش بیسن پر جھک کر کلّی کرنے لگا۔ منھ کچھ نمکین ہو گیا اور زبان کڑوی، دانت کرکرانے

لگے۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ کئی دن سے رات میں سو نہیں پاتا۔ منھ کے ذائقے کا ستیاناس ہو کر رہ گیا۔ سوؤ گے بھی تو کیسے۔ آدھی آدھی رات کو اُٹھ کر تو میرے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتے ہو۔ تم چڑھنے دیتی ہو۔ ہو بھی اِس قابل۔ میرا کیا بس یہی مصرف رہ گیا ہے، کیا میں کوئی کائی لگی ہوئی چٹّان ہوں کہ تم چڑھتے رہو اور پھسلتے رہو بلکہ پھسلو کچھ زیادہ ہی۔ کڑک چائے بنا کر لاؤ۔ رات میں بتاؤں گا چائے لاؤ، پھر میں جاؤں نہانے، جلدی آفس پہنچنا ہے۔ اُس نے کہا، دفتر جا کر کرتے کیا ہو، ایک پیسے کی کمائی نہیں۔ بیوی ترش روئی سے بولی۔ اچھا، اتنے عیش تو کر رہی ہو۔ عیش؟ اتنا بجٹ تو بڑھا نہیں سکے کہ ایک بچہ ہی پیدا ہو جاتا۔ یہی رٹ لگا رکھی ہے کہ ابھی نہیں۔ ابھی نہیں۔ تین سال ہو گئے، شادی کو، اس منحوس شادی کو۔ دیکھ لینا میں جلد ہی اس عمر سے نکل جاؤں گی۔ چائے، میں نے کہا نا کہ چائے کی پیالی۔ گرم، بہت گرم۔ آج موسم بہت خراب ہے۔ بیوی پیر پٹکتی ہوئی کچن کی طرف جانے لگی۔ تمھارے ہاتھ کے بنائے ہوئے مکانوں کے نقشے کسی کو ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ کوئی انھیں پسند نہیں کرتا۔ پتہ نہیں کیسے آرکیٹیکٹ ہو۔ ہو بھی یا جعلی ڈگری ہے۔ اوپر سے آفس کھول کر بیٹھے ہیں۔ گلوبل کنسٹرکشن کمپٹی، ہونہہ۔ وہ اُسے کچن میں اِدھر سے اُدھر چلتا پھرتا دیکھ رہا تھا۔ اُس کی چال میں شہوانیت تھی۔ وہ زہریلے انداز میں مسکرانے لگا۔

یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے۔آس پاس کے چھوٹے چھوٹے گاؤوں سے گھرا ہوا۔شہر کے علاقے سے وہ شاہراہ بہت نزدیک ہے جو ملک کے مغربی خطّے کو مشرقی خطّے سے ملاتی ہے۔ اس شہر میں یا تو مالدار بنیے ہیں جن کی اولادیں ڈونیشن کے ذریعے ڈگری پاس کرکر کے اپنے کلینک اور نرسنگ ہوم کھولتی جا رہی ہیں یا پھر اہلِ حرفہ اور معمولی کاریگر ہیں، بڑھئی، درزی، کارچوبی اور راج گیر تو یہاں کے دور دور تک مشہور ہیں۔ یہاں کا سرمہ اور فرنیچر بیرونِ ملک تک جاتا ہے۔ یہ ایک صاف ستھرا شہر ہے (اب تو خیر سارے شہر میں کھدائی کا کام چل رہا ہے) اور مذہبی رواداری نیز امن وامان کے لیے بھی پورے صوبے میں شہرت رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ضلع کے سارے اعلیٰ حکّام اپنی ملازمت سے سبکدوشی ہو جانے کے بعد مستقل طور پر یہیں بس جانا چاہتے ہیں۔اس لیے شہری ترقی کے نام پر پچھلے پانچ چھ سالوں سے یہاں کئی قیمتی پراجیکٹ چل رہے ہیں اور بلڈر مافیا شہر میں روز بروز مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔کئی چھوٹے چھوٹے گاؤوں کی زمینیں کٹ کٹ کر کالونیوں میں بدل چکی ہیں۔ شہر پھیلنے لگا ہے اور مضافاتی علاقوں میں دور تک نئے نئے فلیٹ بنتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھیں اطراف میں کئی شاپنگ مال بھی کھل گئے ہیں اور کچھ فیکٹریاں بھی جو مقامی سیاست کی کشمکش کا خوش آئند نتائج ہیں۔ انھیں میں وہ مشہور گوشت کی فیکٹری بھی ہے جہاں جدید

ترین مشینوں کے ذریعے بڑے جانور ذبح کیے جاتے ہیں اور اُن کے گوشت کی، انٹرنیشنل معیار کے مطابق عمدہ پیکنگ کی جاتی ہے اور اُسے نہ صرف ملک کے دوسرے خطوں میں بے حد احتیاط، صفائی اور حفظانِ صحت کے اُصولوں کا خیال رکھتے ہوئے پہنچایا جاتا ہے بلکہ کئی خلیجی ممالک کو ایکسپورٹ بھی کیا جاتا ہے۔ ذبح میں نکلے ہوئے خون کو مشینوں اور پائپوں کے ذریعہ زمین کے اندر پہنچا دیا جاتا ہے۔سافٹ اور کولڈ ڈرنک بنانے والی مشہور کمپنیوں نے بھی اپنی اپنی فیکٹریاں کھولنا شروع کر دی ہیں۔ جہاں ان مشروبوں کا ڈرائی فارمولا سفوف کی شکل میں تیار شدہ بھیجا جاتا ہے مگر پانی نہیں۔ پانی کو مقامی سطح پر ہی فراہم کیا جاتا ہے۔آؤٹ سورسنگ اور سرمایہ کاری کا یہ ایک منافع بخش کاروبار ہے۔اس کے علاوہ تعلیم کے نجی سیکٹر میں شامل کیے جانے کے بعد سے یہاں انجینئرنگ، میڈیکل اور مینجمنٹ کالج بہت بڑی تعداد میں کھلتے جا رہے ہیں یہ شہر چھوٹا ہے اور اتنا پھیلاؤ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے جنگل، کھیت، تالاب اور جھیلیں سب سیمنٹ کے گھروندوں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ یہی نہیں جگہ جگہ فِلائی اوور بنائے جا رہے ہیں، اس لیے پچھلے کئی سالوں سے یہ پورا شہر اُدھڑے ہوئے سوئیٹر کی طرح نظر آنے لگا ہے۔سڑکیں، گلیاں سب کھدی ہوئی نظر آتی ہیں۔ چلنے والوں کو اسی ملبے سے بچ کر نکلنا ہوتا ہے۔ چاہے اُنھیں اسپتال جانا ہو یا کچہری یا پھر سڑک کنارے کھڑے ہو کر گول گپّے ہی کیوں نہ کھانا ہوں۔ بہت سنبھل کر چلنا ہوتا ہے۔ کہیں بھی کوئی گڈّھا راستے میں آ سکتا ہے۔جس میں کیچڑ اور پانی بھرے ہوں۔ گڈّھے میں گر کر کوئی بھی اپنے ہاتھ پیر تڑوا سکتا ہے یا پھر سڑک کے بیچوں بیچ ڈالی جا رہی سیور لائن کے کھلے ہوئے مین ہول پل بھر میں کسی کے پیٹ سے نکلے ہوئے فُضلے یا کینچوئے کی طرح آپ کو شہر کے دوسرے حصے پر بہنے والی قلعے کی ندی کے کنارے پر واقع بائیوگیس کے پلانٹ میں پہنچا کر جہنم رسید کر سکتی ہے۔ ان نئی بنی ہوئی کالونیوں تک جانے کے لیے آپ کو اتنا ہوشیار تو رہنا ہی پڑے گا۔ چاہے آپ کے پاس بائیک ہو،

سائیکل ہو یا رکشہ ہو مگر سب سے زیادہ خطرہ تو پیدل ہی چلنے والوں کو اُٹھانا پڑے گا اور اگر اتفاق سے بارش ہو رہی ہو، پھر تو کہنا ہی کیا۔

یہ بھی ایک نئی سوسائٹی بن کر تیار ہوئی ہے۔ تین منزلہ فلیٹوں کی۔ اس کا نام لائف اپارٹمنٹ ہے۔ اِس کالونی کے سارے مکان باہر سے پیلے رنگ کے پُتے ہوئے ہیں اور مکان کے اندر باہر کے رنگ سے کچھ کم پیلا رنگ کیا گیا ہے۔ پچھلے آٹھ سالوں سے یہی رنگ فیشن میں ہے اور آرکی ٹیکٹ مکانوں کے نقشے تیار کرنے کے بعد اِس رنگ کی سفارش کرتا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ مکانوں کے ڈیزائن سے اِسی رنگ کی ایک خاص مطابقت ہے۔ اس رنگ کا فی الحال ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ باہر پھیلی ہوئی پیلی دُھند کی وجہ سے یہ چھوٹے فلیٹ کچھ پھیلے ہوئے اور وسیع وعریض نظر آنے لگے ہیں۔ ایک چھوٹا سا پارک۔ چند ضروری سامان کی دو کانیں اور ہمہ وقت یہاں تک کہ دن میں بھی روشن نیون لائٹس۔ یہ وہ عناصر ہیں جن سے لائف اپارٹمنٹ کی تشکیل وتعمیر ہوتی ہے۔ یہ جس زمین پر بنی ہے وہ پہلے ایک تالاب تھی، جسے پاٹ پاٹ کر اور مٹّی ڈال ڈال کر خشک زمین میں بدل دیا گیا ہے۔ تالاب کے کنارے کبھی ایک بہت پرانا قبرستان بھی ہوا کرتا تھا جس کی قبریں نہ جانے کب کی دھنس چکی تھیں اور اَب وہ ایک بڑے سے گڈھے میں بدل چکا تھا۔ ایک زمانے سے اِس قبرستان میں کوئی فاتحہ تک پڑھنے نہیں آتا تھا اور نہ ہی کوئی مُردہ دفن ہونے۔ چند سال پیشتر تک کچھ آسیبی روایات بھی اِس جگہ سے منسوب رہی تھیں مگر اب شہری منصوبہ بندی اور ترقی کی شاندار اور جگمگاتی ہوئی روشنیوں نے توہم پرستی، خوف اور دہشت کو ہمیشہ کے لیے اپنے اندر نگل لیا تھا۔ اب شاید ہی کسی کو یہ بھی یاد رہ گیا ہو کہ اُس تالاب سے منسلک ایک بہت چھوٹی اور پتلی سی ندی بھی بہا کرتی تھی اور اس طرح کی کالونیوں میں بنے ہوئے مکانات کی بنیادیں انسانی پنجروں اور ہڈیوں کی راکھ اور چونے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ویسے بھی اس قسم کی باتوں کو یاد کرنا یا یاد رکھنا دونوں ہی سرے سے بے تُکا تھا۔ اور کسی حد تک

غیر اخلاقی بھی کیونکہ اخلاقی اقدار کا تعلق ہمیشہ اپنے زمانے سے ہوا کرتا ہے۔ ’زمانے‘ کو تو بُرا کہا ہی نہیں جاسکتا ممکن ہے کہ زمانہ ہی خدا ہو۔ اور یہ زمانہ ایک دوسری اور متبادل اخلاقیات گڑھ رہا تھا۔

لائف اپارٹمنٹ میں بجلی کا کنکشن تو بہت جلد ہو گیا تھا مگر پانی کی قلّت ابھی بھی کسی حد تک موجود تھی۔ ضلع جل بورڈ کا پانی چوبیس گھنٹے میں صرف دوبار آتا تھا جس کا کوئی وقت متعین نہ تھا۔ اس لیے اُسے اسٹور کر کے رکھنا پڑتا تھا۔ پانی کے ذخیرے ساری دنیا میں تیزی سے کم ہوتے جارہے ہیں آئندہ سو سال میں ہمیں پانی کے بغیر خوش دِلی کے ساتھ زندہ رہنا سیکھنا ہوگا اور نسلِ انسانی کو پانی کا کوئی متبادل ڈھونڈنا ہوگا۔ سوسائٹی کی انتظامیہ کمیٹی نے اپنا بورنگ الگ سے کروا رکھا تھا مگر بورنگ کا پانی بہت کھارہ تھا اور اُس میں کیلشیم، میگنیشیم، سوڈیم اور پوٹیشیم کی مقدار خطرناک حد تک تھی۔ اس پانی میں ریت اور مٹّی کے ذرّات بھی ملے ہوئے تھے جن کی وجہ سے پانی کا رنگ دھندلا اور مٹیالا تھا۔ ظاہر ہے کہ اِس پانی کو پینا مشکل بھی تھا اور مُضر بھی۔ خاص طور سے گردوں اور پھیپھڑوں کے لیے۔ بورنگ کے پانی کو اُبال کر یا چھان کر بلکہ آر۔او۔ کے ذریعہ بھی آلودگی دور نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہ پانی صرف ٹوائلٹ اور کسی حد تک نہانے یا کپڑے دھونے میں ہی بحالتِ مجبوری استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اوپر سے طرّہ یہ کہ ہر دو تین مہینے کے بعد بورنگ بند ہو جایا کرتا تھا اور پھر نئے سرے سے کوئی دوسری جگہ تلاش کر کے وہاں کی زمین کو کھودنا پڑتا اور بورنگ کرانا پڑتا۔ مگر محلّے کے ذلیل اور نچلے طبقے کے لوگوں کے درمیان رہنے سے کہیں بہتر تھا کہ ہر شریف آدمی کو اس طرح کی نئی کالونیوں میں آکر بس جانا چاہیے۔ یہاں اتنی روشنی تھی، اتنا سکون تھا اور بلند سماجی مرتبہ تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں شریفوں کے بچوں کو کھیلنے کے لیے اچھے اچھے پارک ہیں اور وہ اَب محلے کے گھٹیا لوگوں کے بچوں کے ساتھ کھیل کر بگڑیں گے نہیں۔ اب رہا وہ زرد غبار اور رہی وہ پیلی دُھند تو جہاں نئی تعمیر ہوتی ہے وہاں یہ غبار اور ملبہ ہونا لازمی

ہے۔ اِس غبار کو دیکھا ہی کیوں جائے۔ زمین کھودی جا رہی ہے۔ اُس میں گڈّھے کیے
جا رہے ہیں۔ چاروں طرف مٹّی اُڑ رہی ہے یا پھر کوّے۔ اِس غبار کو دیکھا ہی کیوں جائے
اِن کوؤں کی کائیں کائیں سنی ہی کیوں جائے۔ آنکھوں پر کالا چشمہ لگا لیا جائے اور گھر سے
نکلنے سے پہلے اور گھر پہنچنے کے بعد اچھی طرح مَل مَل کر نہا لیا جائے۔ بس اتنا ہی تو کرنا
ہے۔ اپارٹمنٹ کے تقریباً تمام افراد مع بچوں کے کالا چشمہ لگا کر باہر نکلتے ہیں اور واپس
آ کر خوشبودار صابنوں سے غسل کر لیتے ہیں۔ ایک معیاری زندگی گزارنے کے لیے کیا یہ
زیادہ ہے۔

اُس نے بیوی کے ہاتھ سے لے کر چائے کا کپ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ بیوی نے
جلدی جلدی اپنے ہاتھ کو اوپر نیچے کرنا شروع کر دیا۔ یہ اُس کی مدتوں پرانی عادت تھی۔
اُسے یہ وہم تھا کہ بار بار اُس کا ہاتھ سن ہو جاتا ہے۔ نہ تو میرے اندر خون بچا ہے۔ سارا
خون جل گیا ہے اور نہ ہی کچھ اور وہ بڑبڑاتی۔ ویسے دیکھنے میں وہ ایک صحت مند اور طویل
القامت عورت تھی جسے سطحی نظر رکھنے والے خوبصورت بھی کہہ سکتے ہیں اگرچہ عورت کو مرد
سے زیادہ خوبصورت سمجھنا تمام جانداروں میں صرف انسانوں کا ہی حماقت آمیز فیصلہ ہے۔
عورت عقل مند اور طاقت ور تو ہے۔ بشرطیکہ طاقت کو اُس کے اصل مفہوم میں سمجھا جائے مگر
اُس کی خوبصورتی کے بارے میں ہمیشہ شک کیا جانا چاہیے کیونکہ وہ معاشرے کی تشکیل کرتی
ہے اور سماج پر مرد سے زیادہ حاوی ہے۔ چاہے لاکھ اس سماج کو مردوں کا سماج کہا جائے۔
کیا اس قسم کی کوئی بھی جابر شے خوبصورت ہوگی مگر عورت کا سماج پر حاوی ہونا انسان کی ننگی
آنکھوں سے ہرگز نہیں دیکھا جا سکتا۔ اُس کی طاقت خون کی بال کی طرح باریک رگوں میں
اپنا جال بنا کر معاشرے کی پوری ذہنیت کی ساخت کی تشکیل کرتی ہے۔ عورت کی طاقت کو
اُس خوردبین کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے جس سے کسی جرثومے یا وائرس کو۔ کیڑے
مکوڑے تک اِس معاملے میں انسانوں سے زیادہ عقلمند ہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ انسانی معاشرے

کے نروں سے زیادہ سمجھ دار وہی ہیں۔ اِس لیے عورت کے جسم کو حسین سمجھ لینا ایک اندھے حیوان تک کے لیے مشکل بات ہے۔عورت کے جسم کا ہر حصہ اتنا زیادہ فاضل گوشت سے بھرا ہوا اور تھل تھل کرتا ہوا چربی زدہ ہے کہ یہی ایک بات اس امر کی گواہ ہے کہ یہ خوبصورتی نہیں ہے۔عورتوں کے جسم کا رنگ بھی قدرتی طور پر اتنا چمکیلا نہیں جتنا کہ ایک مرد کے جسم کا ہوتا ہے۔اسی لیے اُنھیں میک اَپ کی ضرورت پڑتی ہے۔نئی نویلی دُلہن کو بغیر میک اَپ کے زیادہ دِن دیکھنے سے مرد کا دماغ خراب ہوسکتا ہے۔دن میں، گھاس میں پڑا ہوا، سکڑا ہوا، پر ڈالے ہوئے ایک بے سدھ نر پتنگا بھی اپنے رنگوں کے لحاظ سے رات کو اُڑنے والی مادہ پتنگے سے زیادہ چمکیلا ہے۔مرد تو صرف جنگ کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور اب تو جس طرح کی جنگ ہوتی ہے اس میں بھی مردوں کا کوئی خاص کام نہیں رہ گیا ہے۔اب ان کا ایک ہی کام ہے کہ وہ عورتوں کے پیٹ میں اپنا بیج ڈالتے پھریں۔ایک بدعقل آوارہ گھومتے ہوئے سانڈ کی طرح اور اس طرح انھیں اور بھی زیادہ مضبوط بناتے پھریں۔اصل حاکم یقین مانیے کہ عورت ہی ہے۔اُس نے یونہی کھڑے کھڑے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور فوراً منھ سے اُسے باہر نکالتے ہوئے کلّی سی کر ڈالی۔چائے ہے یا زہر؟ وہ چلّایا۔میرے منھ پر ہی کلّی کر دیتے نا۔وہ زور زور سے اپنا ہاتھ اوپر نیچے کرنے لگی اور اُس کے بھورے بالوں کا جوڑا کھل کر بکھر گیا جس کی وجہ سے اُس کی ایک آنکھ ڈھک گئی۔وہ اِسی چہرے سے ڈرتا تھا جب بھی اُس کی ایک آنکھ ماتھے سے سرکے ہوئے بالوں سے ڈھک جاتی اور بس ایک آنکھ چہرے پر نظر آتی۔اس ایک آنکھ میں ایک سرد اور خوفناک حکم تھا۔دراصل یہی ایک اصل جابر حاکم کی آنکھ تھی۔کسی دیومالائی کردار کی غصّہ ور آنکھ۔اگر اُس کے چہرے پر دونوں آنکھیں نظر آتی رہتیں تو وہ اِس غضبناک چہرے کا مقابلہ کر بھی سکتا تھا مگر ماتھے پر صرف ایک بڑی بھوری اور سرخی مائل آنکھ گھورتی نظر آتی ہے۔تقریباً ایک شیطانی آنکھ جس پر کبھی گہائی تک نکلنے کی ہمت نہیں کر سکتی۔وہ واقعی ڈر گیا۔اُسے معلوم تھا کہ بُری نظر بھی

ایک ہی آنکھ سے لگتی ہے اور جس آنکھ سے لگتی ہے اُس میں کبھی آنسو نہیں ہوتے۔چائے کا کپ اُس نے ایک اسٹول پر پہلے ہی رکھ دیا تھا۔اُس خشک آنکھ سے اپنی آنکھیں پھیرتے ہوئے غسل خانے میں جا کر اُس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔وہ شدید سے شدید گرمی میں بھی گرم پانی ہی سے نہاتا تھا۔اُس نے سب سے پہلے گیزر کا سوئچ آن کیا۔سوئچ آن کرنے پر ہلکا سا اسپارک کرتا تھا۔گیزر کی لال بتّی روشن ہوئی مگر اُس لال بتّی کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔گیزر میں ایک عجیب خرابی پیدا ہوگئی تھی وہ کبھی گرم پانی دیتا تھا اور کبھی برف کی طرح ٹھنڈا۔پوری سردیاں اِسی طرح بیت گئیں۔گرم پانی کی علامت اُس لال بتّی کے نیچے وہ کانپتا اور ٹھٹھرتا رہا۔درمیان میں کبھی کبھی گرم پانی کا ریلہ بھی آجاتا جیسے خواب میں کسی دوست کا چہرہ نظر آجائے۔وہ اپنی مصروفیات کی بنا پر (اگر واقعی اُس کی کوئی مصروفیت تھی) اور کچھ اس یقین کی بنا پر کہ ایسی عجیب وغریب تکنیکی خرابیاں جلدی دور نہیں ہوتی ہیں۔کیونکہ اِن کا ایک نادیدہ رشتہ انسانوں کے مقدر اور ستاروں کی گردش سے ہوتا ہے۔یہ پُراسرار باتیں ہیں اور فی الحال وہ پُراسرار باتوں کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہوا شیو کر رہا تھا۔یہ بھی ایک چٹخا ہوا آئینہ تھا۔چٹخے ہوئے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ دیکھ کر شیو کرنے کے دوران اکثر اُس سے اندازے کی غلطی ہو جاتی۔بلیڈ کہیں کا کہیں چل جاتا۔چہرے پر لگے ہوئے صابن کے سفید گاڑھے جھاگوں میں خون کی لکیریں شامل ہو جاتیں۔آئینے کا نہ بدلنا یقیناً اُسی کی لاپرواہی تھی مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ آئینہ چاہے چٹخا ہوا نہ بھی ہو تب بھی ہر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر آدمی کی آنکھیں ہمیشہ اندھیرے میں غلطاں ہوتی ہیں۔وہ مستقبل کے بارے میں تو زیادہ ہی بے خبر ہو جاتا ہے۔صابن کے سفید جھاگوں سے اُس کا سانولا چہرہ اِس طرح ڈھک گیا جیسے کسی گڈّھے میں کالے اور سڑتے ہوئے پانی پر سفید ریت اور چونا ڈال کر وقتی طور پر ڈھک دیا جاتا ہے۔اُس نے اِس چہرے سے جھانکتی ہوئی آنکھوں سے اپنے دائیں ہاتھ پر نکلے ہوئے پھوڑے کے

پرانے نشان کو دیکھا۔ وہ ہمیشہ شیو بناتے ہوئے اِس زخم کے نشان کو دیکھتا۔ یہ نشان ہتھیلی
کے بالکل نیچے کلائی پر اُس جگہ واقع تھا جو گالوں پر ریزر چلاتے وقت بار بار نمایاں ہو جاتی
تھی۔ اگر یہ زخم اُس کے چہرے پر اپنا نشان چھوڑتا اور کسی پھوڑے کے باعث نہیں بلکہ چاقو
یا تلوار کے کسی خطرناک وار کے نتیجے میں وجود میں آیا ہوتا تو کسی بھی عورت کے لیے اُس کی
شخصیت میں سیکس اپیل بہت بڑھ جاتی۔ اُس نے شیو کرنے والے بُرش سے کلائی پر آئے
ہوئے اِس بھدّے نشان پر صابن کے سفید جھاگ لگا دیے، بالکل اُسی طرح جیسے دیوار پر
اُبھر آئے ہوئے کسی بدنما سیلن کے دھبّے پر سفیدی پوت دی جاتی ہے۔ غسل خانے کی کھڑکی
کے باہر پھیلا ہوا پیلا غبار اُسی طرح ساکت و جامد موجود تھا۔ آج دفتر پہنچ کر وہ اُن تصاویر
سے کچھ نئے گوشے نکال کر مکانوں کے چند نقشے نمونے کے طور پر بنائے گا۔ جن کا البم کئی
ہفتوں کی محنت کے بعد وہ حاصل کر پایا تھا۔ یہ قبرستانوں کی تصویریں تھیں اور شمشان
گھاٹوں کی بھی۔ قبرستان میں جا جا کر طرح طرح کی پکّی قبروں کی تصویریں جو اُس نے
پوشیدہ طور پر اپنے کیمرے سے لی تھیں۔ کئی ہفتوں سے وہ شہر کے قبرستانوں کا چکر لگاتا پھر
رہا تھا۔ کبھی فاتحہ پڑھنے کے بہانے کبھی کسی عزیز یا دوست کی قبر تلاش کرنے کے بہانے اور
اُن دنوں کسی کی تدفین تو اُس نے چھوڑی ہی نہیں تھی کیونکہ قبرستان تک جانے کا کوئی موقع
وہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ قبرستانوں کے گرد اب فصیل بندی کر دی گئی ہے اور
بے وجہ قبرستان میں گھومنے پھرنے والے کو شک کی نظر سے دیکھا جانے لگا ہے۔ وجہ یہ ہے
کہ انسان بجّو جیسے قبر کھودو حیوان سے بھی بدتر ہو گئے ہیں۔ بجّو تو پھر بھی اپنا پیٹ بھرنے کے
لیے قبر کھود کر مُردے کھاتا ہے۔ مگر انسان تو قبروں سے لاشیں نکال نکال کر بیرونی ممالک
کے میڈیکل کالجوں میں اسمگل کرنے لگے ہیں تاکہ ان کے اعضا نکال کر اُن پر نئے نئے
تجربے کیے جا سکیں۔ تجربہ تو وہ بھی کرنا چاہتا تھا۔ وہ مکانوں کی تعمیر میں وہی رمز پیدا کرنا
چاہتا تھا جو قبروں میں پایا جاتا ہے اور یہ یقیناً فنِ تعمیر میں ایک نیا اضافہ ہوگا سنجیدہ باوقار

فکر انگیز اور روحانی بھی۔ آج کل اِتنے اوٹ پٹانگ قسم کے نقشوں پر مبنی مکان تعمیر کیے
جاتے ہیں اور اتنے بچکانہ، بھدّے اور آنکھوں میں چبھنے والے تیز رنگوں کا استعمال کیا جاتا
ہے کہ ان مکانوں میں رہ کر انسان صرف ڈپریشن کا شکار ہو سکتا ہے۔ یا ہسٹیریا کا یا پھر
کابوسوں کے ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلے کا۔ انسانوں کو اگر حقیقی سکون اپنے گھر میں
چاہیے تو اُس کے بنائے ہوئے مکانوں کے ان نقشوں اور ڈیزائنوں میں مِلے گا جو مختلف
النوع قسم کی قبروں کی اسمبلاژ سے تیار کیے جائیں گے۔ انسانوں کی زندگی میں ہمیشہ موت
کی ایک جھلک، ایک آہٹ ضرور شامل رہنی چاہیے۔ موت کو اپنے گھروں کی دیواروں سے
بے دخل نہیں کرنا چاہیے۔ ہم اپنے پاس نئے اور پرانے نوٹ ایک ساتھ جمع کر کے رکھتے
ہیں پھر ایک دن آتا ہے جب پرانے نوٹ واپس لے لیے جاتے ہیں اور نئی سیریز کے نوٹ
بازار میں داخل کر دیے جاتے ہیں۔ لوگ نہ مرتے مرتے تھکتے ہیں اور نہ پیدا ہوتے ہوتے
اِسی لیے گھروں میں دونوں رنگ شامل ہونا چاہئیں۔ زندگی اور موت کی ایک جُگل بندی۔
وہ جب بھی قبرستان سے باہر آتا موت کا کوئی چیتھڑا اُس کے جوتے کے تلے میں چپک کر
اُس کے ساتھ باہر آ جاتا۔ وہ اُسے اپنے پیروں کے تلووں میں صاف اور واضح طور پر محسوس
کرتا۔ اُس کی ٹھنڈک کو، اُس کی اُداسی کو اور اُس کے رمز کو یا اسرار کو۔ اسرار تو کسی بھی قسم کا ہو
اُسے جانا نہیں جا سکتا صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اُسے یہ احساس تھا کہ اُس کی بیوی بھی
ایک اسرار ہے بلکہ یہ شادی بھی ایک اسرار ہی تھی جو کیوں ہوئی۔ اُس کی کوئی خاص وجہ آج
تک سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ بس اتنا ضرور تھا کہ اُن دنوں شادی سے کچھ ماہ پہلے اُس کی جنسی
خواہش ناقابلِ یقین حد تک بڑھ گئی تھی۔ اُسے ایک ہی رات میں کئی کئی بار احتلام ہو جایا
کرتا تھا۔ اُسے احتلام سے ہمیشہ سے ہی بہت ڈر لگتا تھا کیونکہ خواب میں نکیلے اور لمبے
دانتوں والی چڑیلیں پاؤں میں پائل باندھے چھن چھن چھن کرتی ہوئی اُس کے جسم کا سارا
خون پی جانے کے لیے اُس کی چھاتی پر آ کر سوار ہو جاتیں۔ اُسے لگتا جیسے وہ پیلا پڑنے لگا

ہے۔ اِس لیے اب یہی ایک شریفانہ حل رہ گیا تھا اور وہی اُس نے تلاش کرلیا۔ دوستوں
سے کہہ کہلا کر ایک رشتہ طے کیا اور ایک عورت کو گھر میں لے آیا۔ عورت جس کے کہنے کے
مطابق خود اُس کے اپنے جسم میں بھی خون جل گیا تھا مگر پھر بھی وہ ایک صحت مند عورت تھی
اور حکم چلانے کا مادّہ رکھتی تھی۔ بیوی نے کچن میں جا کر انڈے تلاش کرنا شروع کر دیے۔ وہ
ہمیشہ انڈے کہیں رکھ کر بھول جاتی تھی۔ فریج میں انڈے رکھنے کے وہ سخت خلاف تھی۔ اُس
کا خیال تھا کہ فریج کی ٹھنڈک سے انڈوں کی زردی جم جاتی ہے اور اُسے کسی بھی جمی ہوئی
چیز کو پگھلانا سخت ناپسند تھا۔ پگھلنے کا منظر اُسے کریہہ نظر آتا تھا۔ وہ تو پگھلتا ہوا مکھن، گھی اور
یہاں تک کہ برف کو بھی پگھلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی، اسی لیے اُس نے پاور کٹ کے
زمانے میں اپنے گھر میں آج تک موم بتّی نہیں جلائی۔ یہ اتفاق نہیں تھا کہ اپنے شوہر کے
کہیں بھی ہاتھ لگانے سے، چھو لینے سے یا بوسہ لینے کی رسمی اور اخلاقی کوشش سے بھی وہ
نہیں پگھلی۔ اُس کے جسم میں رقیق مادّوں اور پانی کی بہت کمی تھی۔ اُس کے ہونٹ بھی خشک
رہتے تھے اور آنکھیں بھی۔ دل کا پتہ نہیں، دل کا پگھلنا تو محض محاورہ ہے۔ اب یہ تو بالکل
صاف ہے کہ اُن دونوں میں محبت نہیں تھی اور اگر ہوتی بھی تو بھی کیا۔ محبت اور نفرت دو ایسی
ندیوں کی مانند ہیں جو تھوڑا سا فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے برابر برابر چلتی ہیں، مگر کبھی کسی شہر یا
گاؤں میں پہنچ کر الگ الگ سمتوں میں نکل جاتی ہیں۔ چکّر کاٹتی ہیں، بَل کھاتی ہیں، کبھی
کبھی تو سانپ کی طرح پھر بہت دور کہیں آگے جا کر کوئی ایسا مقام ضرور آتا ہے جہاں دونوں
ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ پھر جو پانی آگے بڑھتا ہے اُس میں سوائے تکلیف،
حسد و جلن اور اوچھے پن کے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ آگے بڑھتا ہوا پانی محبت اور نفرت دونوں
سے زیادہ کمینے اور خطرناک سمندر میں جا کر گر جاتا ہے۔

جہاں تک ان دونوں کے یہاں بچوں کے نہ ہونے کا سوال ہے تو اس کا ذمہ دار اپنے
شوہر اور اُس کی معاشی مجبوریوں کو ٹھہرانا ایک غلط الزام تھا۔ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتی

تھی کہ اس کے جسم میں ایک بھیانک خشکی تھی۔ یوں تو وہ ماں بننا چاہتی تھی مگر اِسے کیا کیا
جائے کہ شوہر سے مباشرت کے وقت (اگر اِسے مباشرت کہا جا سکتا ہو) بغیر کسی محبت اور
خواہش کے ساتھ سوکھے ہوئے ہونٹ، لعاب سے یکسر خالی منھ، زبان اور خشک اندام نہانی
کے ساتھ لیٹے رہنا دراصل ریپ کے عمل سے بھی زیادہ گھناؤنا اور بدتر تھا۔ اگر ایسی صورتِ
حال میں اتفاق سے اُس کی کوکھ میں کسی بچے کا بیج پڑ بھی جاتا تو وہ ایک بدنصیب اور بِن
بُلائی جان ہی ہوتی۔ وہ خود بھی برف کی ایک جمی ہوئی چٹان تھی۔ اُسے اپنے آپ سے بھی
چڑ تھی اور اپنے آپ کو پگھلتے ہوئے دیکھنے سے تو اُس سے بھی زیادہ۔ جہاں تک خواہش کا
سوال ہے تو وہ جسم کی ایک بڑی غلط فہمی ہے۔ وقت کا ایک ذرا سا پانسہ پلٹنے پر، جسم کے اندر
بہنے والے کیمیائی مادوں کی معمولی سی غداری سے ہی وہ کینہ پرور، مذاق اُڑاتی ہوئی کٹنی
روشنی پیدا ہو جاتی ہے جس میں محبت، نفرت، خواہش اور مامتا سب ایک ساتھ کسی جادوئی
طاقت کے زیر اثر سر کے بَل کھڑے نظر آتے ہیں اس لیے اصل بات جو بغیر کسی اخلاقی فراڈ
کے اور لاگ لپٹ کے، کہی جا سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ مرد اپنے، تقریباً ہر وقت ایستادہ عضوِ
تناسل سے عاجز تھا اور عورت اپنی سوکھی ہوئی معذور اندامِ نہانی سے۔

ٹھیک اُسی لمحے میں بجلی چلی گئی۔ جب اُس نے فرائی پان میں انڈے توڑے، گرم گرم
تیل میں ایک ناگوار آواز کے ساتھ زردی اور سفیدی دونوں اپنی اپنی الگ دنیا میں سکڑتی
جا رہی تھیں۔ آج کل صبح صبح بھی جانے لگی ہے۔ وہ بڑبڑائی۔ گرمی بڑھ رہی ہے، بجلی جانے
کا سب سے بڑا نقصان تو یہی ہے کہ پسینہ آئے گا۔ اندھیرا تو برداشت کر ہی لیا جاتا ہے۔
روشنی کوئی اتنی اچھی چیز بھی نہیں مگر پسینے میں جسم پگھل پگھل کر بہتا ہے۔ جسم اپنے کناروں
سے باہر آنے لگتا ہے۔ نمکین گندے رقیق مادّے کی شکل میں اور بدبودار پانی کی شکل میں۔
بجلی کیوں چلی گئی؟ اتنی دیر میں بجلی آ گئی۔ لابی میں لگے ہوئے چھت کے پنکھے کے پَر ابھی
پوری طرح گھوم بھی نہ پائے تھے کہ بجلی پھر چلی گئی۔ اُس نے بجلی کو کوسنا شروع کر دیا اور اپنے

ہاتھ کو اوپر نیچے کرنا بھی۔مگر بجلی کو کوسنے سے بہتر تھا کہ اپنے مقدّر کو کوس لیا جائے۔بجلی کی اپنی ایک الگ شخصیت ہے جیسے پانی کی۔اُس کے اپنے اُصول ہیں اور اپنی اخلاقیات۔

پیار محبت
غم غصہ
رونے اور شہوت میں
وہ پیدا ہوتی ہے
پانی سے اُس کی عظیم دوستی کی
مچھلیاں قسمیں کھاتی ہیں
مچھلیاں جو اپنی دُم کے/آخری حصّے میں اُسے سلا کر رکھتی ہیں
شارک نے اُس کے جھٹکے کو محسوس کیا اور شِو کے تانڈو جیسا رقص دیکھا
پانی میں رقص
اس رقص کے کوئی معنی نہ تھے
اس رقص میں لفظ نہ تھے
نصاب کی کتابیں کبھی کافی نہیں ہوتیں
ربڑ کے دستانے پہن کر
لکڑی پر پیر یا ہاتھ جما لینے سے
ہم اُس سے آزاد نہیں ہو سکتے
اُس میں ایک رمز ہے
جو اِس نظم میں نہیں

خالد جاوید

Tell me when the storm is over
When all the lights are down and the sound of thunder claps
Bringing silence than a flash
Only the electricity brings light
Shooting from the sky
Brings a new life to the ground
Killing everything around
the smell of dirt and brunt tissue forming dust and smoked death.

Azzy Writes

کیا صابن سڑ رہا ہے؟ اُس نے غسل خانے میں بہت ہی عجیب سی ناگوار بُو محسوس کرتے ہوئے سوچا۔ گیزر کی ٹونٹی کے نیچے بالٹی پانی سے آہستہ آہستہ بھر رہی تھی۔ بجلی چلی گئی تھی۔ بس کھڑکی کے شیشے سے پیلا غبار اپنا عکس پانی پر ڈال رہا تھا۔ اُس نے بالٹی کے پانی میں جھانکا۔ پانی زرد نظر آیا۔ باہر پھیلے ہوئے اُس حبس زدہ غبار کو دل ہی دل میں برا بھلا کہتے ہوئے اُس نے بالٹی کے پانی سے مگ بھر کر اپنے سر پر اُنڈیلا۔ پانی پہلے اُس کی آنکھوں میں داخل ہوا پھر وہاں سے بہتا ہوا ناک کے نتھنوں میں اور اُس کے بعد اُس کی گنجی اور چکنی کھوپڑی سے پھسلتا ہوا کنپٹیوں اور کانوں کے درمیان ایک پَل کو رُکتا ہوا بہت تیزی کے ساتھ دونوں کانوں کے اندر چلا گیا۔ اُس کے تازہ تازہ شیو کیے ہوئے چہرے پر سے پھسلا اور ہونٹوں کے کناروں کو گیلا کر دیا۔ اُس نے ایک سانس منھ کھول کر لی تو کچھ بوندیں منھ کے اندر پہنچ گئیں۔ پانی اب گردن سے بہتا ہوا، اُس کے کندھوں، پیٹ اور پیٹھ تک آ کر رُک گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا مگ بھر پاتا، اُس نے اپنے منھ، چہرے، آنکھیں، ناک، کان اور یہاں تک کہ اپنے دماغ کو بھی بھیانک بدبو کی یلغار اور نرغے میں پایا۔ اُس کے منھ میں تو جیسے کھارا پیشاب بھرا جا رہا تھا۔ اُس کا جی بری طرح متلایا۔ معدے میں اُلٹیوں کا اور اُبکائیوں کا ایک طوفان باہر نکلنے کو بے چین تھا۔ جسے روکتے ہوئے اُس نے

مگ کو دور دیوار پر دے مارا اور بہت زور سے چیخا۔ یہ کیسا پانی ہے، دروازہ کھولو۔ بیوی نے ایک بار میں نہیں سنا اُسے پسینہ آ رہا تھا۔ وہ پسینے سے پریشان تھی۔ اُس نے نہیں سنا۔ دروازہ کھولو سُور کی بچی، کھول دروازہ۔ غصّے نے اُسے دنیا کا سب سے بہادر مرد بنا دیا۔ خود کیوں نہیں کھولتا کتّے، دروازہ تو نے اندر سے بند کیا ہے۔ عورت دہاڑی۔ وہ دروازہ کھولتا ہے اور غصّے میں حواس باختہ ہو کر ننگا ہی باہر آ جاتا ہے۔ اُس کے بدن سے پھوٹنے والی بدبو لابی میں بھر گئی ہے۔ وہ اُس کے سامنے تن کر کھڑی ہے۔ اندر جاؤ، بے حیا، بے شرم، عورت چیختی ہے۔ تو نے پانی نہیں دیکھا کتیا۔ صبح سے پڑی پھنکا رہی ہے۔ تو نے پیشاب اور پاخانے کی جائے مجھے پلا دی۔ دیکھا نہیں پانی میں کیا ملا ہوا تھا، سُور کی بچی۔ اندر جا بے حیا، باپ کو گالی مت دے ننگے۔ ننگا ہو کر اور ذلیل لگ رہا ہے تُو اور تیرا یہ۔ عورت پوری طاقت سے چلاّتی ہے۔ اُس کے سر کے بال کھل گئے ہیں جن سے اُس کی ایک آنکھ ڈھک گئی ہے مگر اَب وہ اِس چہرے سے نہیں ڈرا۔ وہ غصّے میں اپنی پرانی ہستی کھو چکا ہے۔ ابھی پوچھتا ہوں تجھ سے، آج تو نہیں بچے گی میرے ہاتھ سے ماری جائے گی۔ وہ پاگل کی طرح بڑبڑاتا ہوا دوبارہ غسل خانے میں جا رہا ہے۔ شاید تولیہ باندھنے۔ عورت اُس سے بھی زیادہ پاگل ہوتی ہوئی اُس کے پیچھے پیچھے غسل خانے میں گھس آتی ہے، کسی بَلا یا وَبا کی طرح۔ کیا کرے گا، مار ڈالے گا، کیا پوچھے گا بھڑوے کی اولاد۔ وہ بے لباس، گیلا اور بدبودار اُس کے سامنے کھڑا غیظ و غضب سے کانپ رہا ہے۔ اُس کا ہاتھ اوپر اُٹھتا ہے۔ وہ عورت کو پوری طاقت کے ساتھ پیچھے کی طرف دھکا دیتا ہے۔ وہ تھوڑا سا پیچھے کی طرف جھکتی ہے اور پھر سنبھل کر جواباً اُس کی گردن پکڑ کر دیوار کی طرف دھکیلتی ہے۔ گیزر کے بالکل نیچے۔ اچانک بجلی آ جاتی ہے، گیزر کی لال بتی روشن ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے وہ کسی چیز کا سہارا لینا چاہتا ہے۔ وہ دیوار پر لگے ہوئی بجلی کے ساکٹ کو تھام لیتا ہے۔ ایک دھماکہ، روشنی کا ایک جھماکہ، شارٹ سرکٹ۔ ایک زوردار جھٹکا کھاتے ہوئے اُس کا مادرزاد برہنہ جسم

کسی وزنی پتھر کی مانند لڑھکتا ہوا بالٹی سے ٹکراتا ہے۔ بالٹی اُلٹ گئی، گندے بدبودار پانی سے اُس کے جسم کا نچلا حصہ تر ہو گیا ہے۔ اُس کے دانت پہلے کٹکٹاتے ہیں، پھر بھنچ جاتے ہیں۔ منہ ٹیڑھا ہو کر نیلا پڑنے لگا ہے۔ نیلاہٹ آہستہ آہستہ سارے جسم میں رینگ رہی ہے۔ چند لمحوں تک کے لیے اُس کا نیلا جسم کسی عامیانہ قسم کے آلۂ موسیقی کی طرح جھنجھناتا ہے۔ پھر بے جان ہو جاتا ہے۔ غسل خانے میں اب ایک بُو اور بھی آ کر شامل ہو جاتی ہے، یہ موت کی بُو ہے۔ چند گھنٹوں بعد یا زیادہ سے زیادہ ایک دِن کے بعد، اُس کے کمرے میں الماری کے نیچے رکھے ہوئے اُس کے جوتوں کے تلوں میں چپکی ہوئی موت واپس قبرستان کی طرف رینگ جائے گی۔ موت کا یہ محبوب مشغلہ ہے، گھر سے قبرستان۔ قبرستان سے گھر۔

ساڑھے دس بجے عورت پولیس اسٹیشن فون کرتی ہے۔ پونے گیارہ بجے ایک پولیس انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ اندر داخل ہوتا ہے۔ لاش کہاں ہے؟ باتھ روم میں۔ انسپکٹر سپاہیوں کے ساتھ باتھ روم کے اندر جاتا ہے پھر ناک پر رومال رکھ کر واپس آتا ہے۔ حادثہ کیسے ہوا؟ انسپکٹر پوچھتا ہے۔ پتہ نہیں۔ عورت جواب دیتی ہے۔ پولیس اور کھلا دروازہ دیکھ کر چند پڑوسی اندر آ گئے ہیں۔ دونوں میں روز جھگڑا ہوتا تھا۔ ہمارا جینا حرام کر رکھا تھا۔ ایک کہتا ہے۔ شاید وہ مارا گیا۔ دوسرا کہتا ہے۔ انسپکٹر کڑک کر عورت سے پوچھتا ہے۔ یہ قتل ہے؟ معلوم نہیں۔ عورت جواب دیتی ہے۔ سچ سچ بتاؤ، تم نے قتل کیا ہے۔ تمھیں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ انسپکٹر کہتا ہے۔ نہیں، ہاں۔ عورت انسپکٹر کی آنکھوں میں اپنی ایک کھلی ہوئی آنکھ ڈالتے ہوئے کہتی ہے۔ اُس کے سر کے بال ماتھے پر ابھی بھی لٹکے ہوئے ہیں اور ایک آنکھ اِن بالوں سے بری طرح ڈھک گئی ہے۔ وہ اپنے ایک ہاتھ کو بار بار اوپر نیچے کر رہی ہے۔ انسپکٹر اُس کی کھلی ہوئی آنکھ کو غور سے دیکھتا ہے۔ وہ حیرت انگیز حد تک خشک ہے۔ مگر اُس میں ایک بے حس سی چمک ہے جو محبت اور نفرت دونوں کے دائمی فقدان سے پیدا ہوتی

ہے۔ جواب دو۔ انسپکٹر گرجتا ہے۔ ہاں وہ مارا گیا۔ اُسی چکر میں۔ عورت بڑبڑاتی ہے۔ کس چکر میں؟ انسپکٹر چونکنا ہوکر دلچسپی سے سوال کرتا ہے۔ پانی کے چکر میں۔ وہ پانی کے چکر میں مارا گیا۔ عورت اپنے بال ماتھے سے ہٹاتی ہے اور اَب دونوں آنکھوں سے انسپکٹر کو دیکھتے ہوئے اطمینان کے ساتھ جواب دیتی ہے۔

لائف اپارٹمنٹس کے ہر گھر میں اب گندا اور بدبودار پانی آرہا تھا۔ تین دن گزر چکے تھے۔ انھوں نے پینے کا پانی نہانے اور ٹوائلیٹ کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر پینے کے پانی کا ایک وقت مقرر تھا اور وہ بہت کم مقدار میں آتا تھا۔ تین ہی دنوں میں وہ سخت بیمار پڑ گئے۔ بیمار ہونے والوں میں زیادہ تعداد بچوں کی تھی۔ انھیں دست آنے لگے جن میں خون ملا ہوا تھا۔ اُن کے پیٹ میں اینٹھن اور مروڑ رہنے لگی۔ پھر انھیں بے تحاشہ خون میں ملی ہوئی اُلٹیاں شروع ہوگئیں۔ اُنھیں تیز بخار رہنے لگا۔ یہاں سے آدھے کلومیٹر کی دوری پر ایک نرسنگ ہوم تھا۔ جب اُس میں مزید مریضوں کے لیے کوئی بیڈ خالی نہیں رہا تو وہ شہر کے دوسرے اسپتالوں کی طرف بھاگنے لگے۔ مریضوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ بورنگ والے گندے پانی کی سپلائی روک دی گئی۔ کچھ لوگ سوسائٹی چھوڑ کر اپنے رشتہ داروں یا احباب کے یہاں منتقل ہوگئے۔ یا کسی دوسری جگہ ضروری سامان ساتھ میں رکھ کر کرایہ پر رہنے لگے۔ ماہ کی آخری تاریخ تھی جب اِس بیماری میں مبتلا ایک آٹھ سالہ بچّے کی موت ہوگئی۔ کسی بھی پھیلنے والی بیماری میں پہلی موت کی ہی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ جس طرح پہلی محبت کی۔ اُس کے بعد تو سب عمومی بن کر رہ جاتا ہے۔ مریضوں کے لواحقین اور اسپتال کے عملے کے بیچ جھگڑا شروع ہوگیا۔ سب کا خیال تھا کہ محض اسپتال

والوں کی لاپرواہی کی وجہ سے بچے کی جان گئی ہے ورنہ کالرا سے آج کے زمانے میں کوئی نہیں مرتا۔

مگر کیا یہ واقعی وہی تھا؟ یعنی محض کالرا جس سے اَب کوئی نہیں مرتا۔ ضلع سرکاری اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کے سامنے ایک طویل راہداری میں کھڑے ہوئے لمبی ناک والے اور ایک پیشہ ور مکے باز کا سا چہرہ رکھنے والے نوجوان ڈاکٹر نے کہا، اُلٹیاں ہورہی ہیں، کھال سوکھ رہی ہے، رگ پٹھے سکڑ رہے ہیں۔ ہاتھوں اور پیروں پر جھرّیاں پڑ رہی ہیں۔ دست رُک نہیں رہے ہیں، بخار اُتر نہیں رہا ہے۔ آنکھوں سے چمک غائب ہورہی ہے۔ یقیناً یہ علامات کالرا کی ہیں یا بگڑی ہوئی پیچش کی مگر اینٹی بائیوٹک دوائیں اثر نہیں دِکھا رہی ہیں۔ سیلائن اور گلوکوز چڑھانے پر بھی جسموں میں پانی کی مقدار بڑھ نہیں پارہی ہے۔ ایک ہزار ملی گرام پیراسیٹامول دینے پر بھی بخار ایک ڈگری بھی نیچے نہیں آرہا ہے۔ مریض کے جسم کے دوسرے ضروری اعضا گردے، جگر، پھیپھڑے اور دل آہستہ آہستہ اپنا کام چھوڑ رہے ہیں۔ کالرا جراثیمی بیماری ہے مگر مریضوں کے خون کی جانچ میں کسی جراثیم کا سراغ بھی نہیں مل رہا ہے۔ دوسری بات یہ کہ وائرس سے پھیلنے والی پیٹ کی بیماری میں اس طرح کے دست نہیں آتے اور نہ ہی مریض کا جسم اس حد تک پیلا پڑ جاتا ہے۔ مگر ممکن ہے کہ یہ کسی نئے وائرس سے پھیلنے والی بیماری ہو۔ اس پر تحقیق شروع ہوچکی ہے۔ مگر یاد رکھئے جو بھی ہورہا ہے وہ اُس پانی کے استعمال کی وجہ سے ہورہا ہے۔ جس میں سیور لائن کا گندا پانی آکر مل گیا ہے۔ اب ہمیں کرنا یہ ہے کہ کسی مریض کو بغیر دستانے پہنے چھونا نہیں ہے۔ مریض کے گندے کپڑوں کو جلانا ہے اور اُس کے فضلے کو بھی۔ جی جی، ہم اپنا کام کررہے ہیں۔ آپ یہ کیمرہ تھوڑا مجھ سے دور رکھئے۔ جی، اب بالکل ٹھیک ہے۔ جی تو آپ لوگ بھی اپنا کام کیجئے۔ اب میرے پاس اور کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔ آپ لوگ چیف میڈیکل آفیسر سے بات کرسکتے ہیں۔ سی.ایم.او.، جی ہاں سی.ایم.او. صاحب سے۔ وجہ؟ میں نے بتایا نا کہ

وجہ صرف گندا پانی ہے۔ پانی سے آپ لوگوں کو معلوم نہیں کہ کتنی بیماریاں پھیلتی ہیں۔ مثلاً معیادی بخار تک۔ بہت سی بیماریوں کے بارے میں ابھی پتہ نہیں۔ یہ کیمرہ تھوڑا، اور ادھر اُدھر پیچھے کر لیجئے۔ شکریہ۔ جی اب ٹھیک ہے۔ لیکن پانی کی سپلائی روک دینے کے بعد بھی کیس لگاتار بڑھ رہے ہیں۔ ایک رپورٹر نے پوچھا۔ وائرس نہیں مرتا۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ سوکھی ہوئی سطح پر عام سا وائرس ایک گھنٹہ فعّال رہ سکتا ہے اور گیلی سطحوں یا پانی میں تو لگاتار اپنی نسل بڑھاتا رہتا ہے۔ باتھ روم کی ٹونٹیوں، بالٹیوں، مگوں سے بہت ہوشیار رہنا ہے۔ استعمال شدہ صابنوں کو پھینک دیجیے، باتھ روم کی دیواروں اور فرش کو ہاتھ نہیں لگانا ہے۔ ایسی جگہوں پر تو وہ بارہ بارہ گھنٹے تک فعال رہ سکتا ہے۔ پانی سے بہت بچنا ہے، بہت ہوشیار رہنا ہے۔ آپ لوگ تو باتھ روم جانا ہی بند کردیجئے۔

باتھ روم جانا بند کردیں؟ اِس کا کیا مطلب ہوا۔ کیمرہ مین کے برابر میں کھڑی ہوئی چشمہ لگائے ایک جاذب النظر لڑکی نے سوال کیا۔ لڑکی ٹی.وی. کے کسی چینل کی رپورٹر معلوم ہوتی تھی۔ وہی مطلب ہوا جو آپ سمجھ رہی ہیں۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ تو کیا جنگل میں فارغ ہونا پڑے گا۔ لڑکی بولی، اُس کے ہاتھ میں مائیک تھا جو اُس نے ڈاکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ یہ... یہ میں نہیں جانتا۔ ڈاکٹر نے لاپرواہی سے اپنے کندھے اُچکانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اُس صورت میں خواتین کا کیا ہوگا۔ اِن کالونیوں کے آس پاس اب ایسے جنگل یا زمینیں نہیں بچی ہیں جہاں خواتین اپنی شرم وحیا کو برقرار رکھتے ہوئے فارغ ہو سکیں اور اپنی عزت وعصمت بھی برقرار رکھ سکیں۔ کیا آپ کے خیال میں یہ ممکن ہے؟ لڑکی نے پیشہ وارانہ انداز میں تیزی کے ساتھ جملے ادا کیے جس کی وجہ سے اُس کی آنکھوں کی چمک اڑ گئی۔ اور کیسے؟ دیکھئے ہمارا کام صرف مریضوں کا علاج کرنا ہے۔ ہم اِس صنفی ڈسکورس میں پڑ کر اپنا وقت کیسے برباد کرسکتے ہیں۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ مگر آپ ایک ذمہ دار شہری بھی ہیں اور دانشور طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ اِس بارے میں کیا کہنا چاہیں گے کہ کیا

ایسی بیماری سے خواتین کی ذہنی اور معاشرتی زندگی پر منفی اثرات پڑنے کا خدشہ ہے۔لڑکی نے اپنا سنہری فریم کا چشمہ اُتارا اور اپنی آنکھوں کو رومال سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔ لڑکی کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں۔اُس کے چشمے سے بھی زیادہ خوبصورت۔ڈاکٹر ایک پَل کو اُس کی آنکھوں میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر کہا، مردوں کے لیے بھی شرم و حیا اُتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ خواتین کے لیے۔کیا آپ واقعی اِس پر یقین رکھتے ہیں؟ آپ نے جرنلزم کا کورس کب مکمل کیا؟ اچھا ابھی ایک ماہ پہلے ہی، ویری گڈ۔کِس انسٹی ٹیوٹ سے؟ اوہ اچھا، وہ تو بہت اچھا انسٹی ٹیوٹ ہے۔دیکھئے میں لگاتار آپ سے گزارش کیے جارہا ہوں کہ اپنے کیمرے مجھ سے دور رکھئے۔جی براہِ کرم مجھے کیمرے سے وحشت ہوتی ہے۔آپ مجھ سے خالی وقت میں میرے کمرے میں آ کر مل سکتی ہیں۔ ڈاکٹر نے لڑکی کی طرف مسکراتے ہوئے کہا اور لڑکی نے مسکراتے ہوئے اپنے وینٹی بیگ سے سفید رنگ کا وِزیٹنگ کارڈ نکالا اور ڈاکٹر کے ہاتھ میں تھما دیا۔

لائف اپارٹمنٹس کے فلیٹ آدھے سے زیادہ خالی ہو چکے تھے۔ چالیس مریض جو شہر کے مختلف اسپتالوں میں بھرتی تھے اُن میں سے صرف پندرہ مریض ہی جانبر ہو سکے ہیں۔ ضلع کے حکام اور انتظامیہ کے لیے یہ ایک لمحۂ فکریہ تھا۔ جگہ جگہ اعلیٰ افسران کی میٹنگیں ہونے لگیں۔ مقامی سطح کے سیاست دان بھی فعال ہو گئے اور مخالف پارٹیوں پر خطرناک سازش کا الزام دھرنے لگے۔ وہ بلڈر بھی اُن کی زد میں آ گیا جس نے لائف اپارٹمنٹس کی سوسائٹی کے لیے فلیٹ تعمیر کروائے تھے۔اس بلڈر کی ایک مخصوص سیاسی پارٹی کے ساتھ سانٹھ گانٹھ تھی۔ یہ مخصوص پارٹی کچھ ماہ پہلے ہی اقتدار کی کرسی سے نیچے آئی تھی اس لیے بلڈر پر مقدمہ چلوانے کے مطالبے اور اپیلیں ہونی شروع ہو گئیں۔ میونسپل کارپوریشن کے دفتر میں بے چارے بلڈر کو طلب کیا گیا۔ میٹنگ میں ضلع مجسٹریٹ اور میئر کے علاوہ دوسرے کئی اعلیٰ افسران شامل تھے۔ علاقے کا کارپوریٹر بھی موجود تھا۔سوال یہ ہے کہ سوسائٹی میں پانی فراہم کرنے کے لیے آپ نے کس کمپنی کو ٹھیکہ دیا تھا۔ضلع مجسٹریٹ نے سوال کیا۔ وہ ایک نوجوان آئی۔اے۔ایس آفیسر تھا، ٹرینگ کے بعد اس کی پہلی پوسٹنگ اسی شہر میں ہوئی تھی، وہ سفید بے داغ قمیص اور فاختئی رنگ کی پتلون میں ملبوس تھا، اس کی آنکھیں الو کی طرح گول گول تھیں جن پر اس نے گول شیشوں والی عینک بھی لگا رکھی تھی۔ فی الحال اس کے سرخ و سپید چہرے پر چالاک قسم کی ایمانداری کی چکنائی تھی مگر جلد ہی وہ ایمانداری کے اس

روغن کو اپنے خشک چہرے پر لگانا چھوڑ دے گا۔ کسی کمپنی کو نہیں جناب۔ پانی فراہم کرنے کے لیے کسی کمپنی کو ٹھیکہ نہیں دیا جاتا ہے۔ کیوں؟ کیونکہ پینے کے پانی کے لیے جل نگم میں عرضی دینا کافی ہوتا ہے۔ جل نگم کی فیس ادا کر دی جاتی ہے اور نگم وہاں اپنی پائپ لائن بچھا دیتا ہے۔ بلڈر نے ادب کے ساتھ جواب دیا۔ ٹھیک ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہاں پینے کا پانی بھی آلودہ ہو چکا ہے۔ وہ پیلا اور بدبودار ہے۔ اُس میں انسان کے پیٹ سے نکلا ہوا فضلہ موجود ہے۔ ضلع مجسٹریٹ نے بلڈر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا، نہیں جناب! مجھے اس بارے میں علم نہیں۔ آپ کو کس بارے میں علم ہے؟ بلڈر نے خاموشی کے ساتھ سر جھکا لیا، اسے پہلی بار کسی سرکاری میٹنگ میں شرکت کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا اس لیے اس نے اپنی کالی قمیص کے کالر میں تیز نیلے رنگ کی ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔ ٹائی کی گرہ اتنے کامل طریقے سے باندھی گئی تھی کہ اس کے ایک چھوٹے بندر جیسے چہرے کو مضحکہ خیز بنا رہی تھی۔ کاملیت میں حماقت کا ایک پہلو ہمیشہ نمایاں رہتا ہے خاص طور پر جب آدمی بلڈر کی طرح جوانی کے دور سے باہر نکل گیا ہو۔ سیور لائن بچھانے کا کام کس شعبہ کا ہے؟ میونسپل کارپوریشن کے چیف انجینئر نے ہاتھ اُٹھایا اور کہا، ہمارا شعبہ اِس ذمہ داری کو نبھاتا ہے۔ یہ کام آپ کی نگرانی میں ہوا تھا؟ جی جناب، مگر ہم بعض معاملات میں پی.ڈبلیو.ڈی. والوں سے بھی مشورہ کرتے ہیں کیونکہ وہ لوگ سڑکیں وغیرہ بنواتے رہتے ہیں اور سڑک کے نیچے ہی نالیوں کے پاس تھوڑا اوپر کی طرف سیور لائن بھی ڈالی جاتی ہے۔ چیف انجینئر نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ مگر شاید ضلع مجسٹریٹ کو اُس کا یہ پُراعتماد لہجہ اچھا نہیں لگا کیونکہ وہ آئی.اے.ایس. تھا۔ ضلع مجسٹریٹ نے برا سا منھ بنایا اور کہا یہ آپ مجھے مت بتائیں ہم لوگوں کو سب پڑھایا جاتا ہے۔ انجینئرنگ سے لے کر شاعری تک۔ یس سر، ساری سر۔ میرا مطلب تھا کہ P.W.D. والوں کا بھی اِس کام میں رول رہتا ہے۔ چیف انجینئر نے اپنی غلطی سدھارتے ہوئے کہا۔ آپ کے خیال میں پینے کے پانی میں یہ گندگی کیوں آ رہی

ہے؟ سر، ہمارا خیال ہے، یہ سیور لائن کا پائپ کہیں کریک ہو گیا ہے یا کسی جنکشن پر لیک ہو رہا ہے۔ زمین کھود کھود کر دیکھنا پڑے گا کہ کہاں خرابی پیدا ہوئی ہے۔ اچھا۔ ہوں، اب یہ بتائیے کہ آپ لوگ سیور کے پائپوں کی فراہمی کے لیے کس کمپنی کو ٹھیکہ دیتے ہیں؟ سر، ہر بار ٹینڈر اِیشو ہوتے ہیں۔ کوئی ایک کمپنی کا اجارہ نہیں، ہم سب کو موقع دیتے ہیں اور اُن کے کوٹیشنز کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ چیف انجینئر نے جواب دیا۔ ضلع مجسٹریٹ نے کہا۔ اِن پائپوں کی سپلائی کرنے والی کمپنی اور ٹھیکے دار دونوں کو فوری طور پر نوٹس بھیجیے۔ اُس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ یس سر، بالکل سر۔ مگر میں ایک بات اور کہنا چاہوں گا۔ چیف انجینئر نے کچھ لجاجت سے کہا۔ ہاں بتائیے، کیا بات ہے؟ چیف انجینئر نے کنکھیوں سے میئر کی طرف دیکھا۔ اُس کی میئر سے ایک آنکھ نہ بنتی تھی کیونکہ وہ مخالف پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن جیت کر آیا تھا۔ چیف انجینئر ایک ادھیڑ عمر کا موٹا آدمی تھا۔ اتنا زیادہ موٹا کہ اس کے بیٹھنے کے لیے یہ کرسی ناکافی پڑ رہی تھی اور وہ اس میں کچھ اس طرح پھنس گیا تھا جیسے چوہے دان میں کوئی موٹا سا چوہا پھنس کر ہانپتا ہے اس کی توند کے دباؤ کی وجہ سے اس کی قمیص کے درمیان میں لگے ہوئے بٹن بار بار کھل جاتے تھے جس کی وجہ سے اس کی ناف کے اوپر پیٹ پر سفید بالوں کی ایک بدنما لکیر نمایاں ہو جاتی تھی۔ اچانک ہال کا دروازہ کھلا۔ علاقے کا ایم.ایل.اے. اندر داخل ہوا۔ سارے افسران مع ضلع مجسٹریٹ مؤدبانہ انداز میں اُٹھ کر کھڑے ہو گئے کیونکہ اُن کا نہ اُٹھنا پروٹوکال کی خلاف ورزی کرتا تھا۔ اب کھادی کے سفید کرتے اور پاجامے کا زمانہ بیت چکا تھا۔ وہ تیز گیروئے رنگ کا اونچا سا کرتہ پہنے ہوئے تھا اور اُس نے موٹی موٹی ٹانگوں پر نیلی جینز منڈھ رکھی تھی جس پر عورتوں کے آڑے تنگ پاجامے کا گمان گزرتا تھا۔ اُس کے کولہے بھی عورتوں کی طرح پیچھے نکلے ہوئے تھے۔ وہ جوان آدمی تھا اور اُس کی رنگت جی گھبرا کر رکھ دینے کی حد تک سفید تھی۔ گلے میں گیروئے رنگ کا انگوچھا ڈال رکھا تھا۔ سر تقریباً گنجا تھا۔ مگر مونچھیں لٹک کر ٹھوڑی پر آ رہی تھیں۔ چند

ماہ پیشتر تک وہ صرف ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کا مالک تھا جس کے ٹرکوں پر گھٹیا اشعار لکھے ہوئے تھے۔ الیکشن کے بعد وہ ایم.ایل.اے. ہو گیا، ایم۔ایل۔اے ہونے سے پہلے وہ شہر میں بہت بڑے اغلام باز کی حیثیت سے مشہور تھا اگر چہ اب وہ عورت اور مرد کے فطری اور اخلاقی رشتے کی اہمیت پر اخبارات میں بیان دینے لگا تھا۔ ایم.ایل.اے. نے ہاتھ جوڑ کر سب کو نمسکار کیا اور مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب وہ سب بھی اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ باہر آندھی آنے والی ہے۔ وہ بولا۔ اچھا۔ سارے افسروں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ سیاسی لیڈروں کی چمچہ گیری کرنے کا یہ ایک پرانا طریقہ تھا۔ اچھا آندھی آنے والی ہے۔ اوہ آندھی، وہ کہتے رہے۔ ہاں آنا چاہیے، بہت دنوں سے آسمان پر غبار چھایا ہوا تھا۔ بہت دن ہو گئے سر جی۔ ایم.ایل.اے. نے انگوچھے سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ یہاں اے.سی. چل رہا ہے نا۔ جی سر، چل رہا ہے۔ ضلع مجسٹریٹ نے کہا، کولنگ اور بڑھا دوں؟ نہیں مجھے نزلہ ہو جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے، ایم.ایل.اے.۔ تو کارروائی چل رہی ہے آپ لوگوں کی؟ جی بالکل، ہاں تو آپ کیا کہہ رہے تھے؟ ضلع مجسٹریٹ نے چیف انجینئر سے پوچھا جو ایم.ایل.اے. کے آجانے کے بعد سے کچھ زیادہ خوش اور پُراعتماد نظر آنے لگا تھا۔ جی سر، میں عرض کر رہا تھا کہ ہمارے میئر صاحب کے زور دینے پر شہر کے چند علاقوں میں رسوئی گیس کی پائپ لائن ڈالنے کا کام بھی ایک گیس کمپنی نے میرا مطلب ہے کہ پرائیویٹ گیس کمپنی نے کیا تھا۔ اِن علاقوں میں لائف اپارٹمنٹس والی سوسائٹی بھی آتی ہے۔ اِس گیس کمپنی میں میئر صاحب کی پارٹی کے کئی عہدے داروں کے بڑے بڑے شیئر ہیں۔ چیف انجینئر بول کر چپ ہوا تو میئر کہہ اُٹھا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ میئر پختہ عمر کا ایک وجیہہ آدمی تھا۔ اس کے چوڑے چکلے چہرے پر ایک قسم کا خاندانی وقار تھا مگر اس وقار میں بے رحمی اور غرور کے رنگ زیادہ شامل تھے۔ اس کی بالوں سے صاف، شفاف اور چکنی کھوپڑی ان رنگوں کو اور بھی چمکیلا بناتے ہوئے منعکس کر رہی تھی۔ چیف انجینئر نے جواب

دیا، کچھ نہیں بس یہی کہ گیس کمپنی نے بھی تو سڑکوں کی کھدائی کروائی تھی۔ تو؟ تو اِس سے کیا ہوتا ہے۔ سڑک کی کھدائی تو بجلی والے بھی کرتے ہیں، زیرِ زمین تار ڈالنے کے لیے اور ٹیلی فون والے بھی کرتے ہیں۔ اِن سب کو بھی بلائیے اور جواب طلب کیجیے۔ گیس کمپنی — آپ کو بس گیس کمپنی یاد آئی۔ میئر نے ناخوشگوار اور بلند لہجے میں کہا۔ ایم.ایل.اے. نے میئر کی طرف ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کیا اور بولتا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ رین بو گیس کمپنی کو یہ کام سونپا جائے وہ بہت شریف لوگ ہیں۔ یہ اسٹار گیس کمپنی تو بدنام رہی ہے۔ یہ تو غنڈے موالی قسم کے لوگوں کو اپنی لیبر کے لیے ہائر کرتی ہے۔ سیور لائن کے پائپ انھیں مزدوروں نے توڑے ہیں۔ ایم.ایل.اے. بولا۔ آپ کے پاس کیا ثبوت ہیں؟ میئر نے کہا انکوائری ہونے دیجیے، ثبوت مل جائیں گے۔

آپ کیا کہیں گے؟ ضلع مجسٹریٹ نے بلڈر سے پوچھا، جو اَب تک سر جھکائے بیٹھا تھا۔ جناب میں کیا کہوں، میں نے تو صرف مکان بنوائے ہیں وہ بھی ٹھیکیداروں کے ذریعے، بلڈر پشیمان سا ہو کر بولا۔ اچھا مگر کیا آپ نے مکان خریدنے والوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ آپ بجلی پانی کی سہولیات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اُنھیں پائپ لائن والی گیس بھی فراہم کریں گے؟ جی وعدہ کیا تھا۔ اچھا کتنے عرصے بعد؟ جناب، میں نے میئر صاحب کے رشتہ داروں کے لیے دو ایچ آئی.جی. فلیٹ بُک کیے تھے۔ تب میئر صاحب کے مشورے سے یہ طے کیا گیا جناب کہ پائپ لائن گیس کی سہولت حاصل ہو جانے سے سوسائٹی میں رہنے والے لوگوں کو زیادہ اچھی زندگی، میرا مطلب ہے کہ کوالٹی لائف مل سکتی ہے۔ بلڈر نے جواب دیا اور میئر کی طرف چور نظروں سے دیکھنے لگا۔

اسٹار گیس کمپنی کو بھی نوٹس بھیجیے۔ ضلع مجسٹریٹ نے فیصلہ سنایا۔ میئر ایک بار زور سے کھانسا پھر کہا۔ ہم اس بات کو فراموش کر رہے ہیں کہ سب سے پہلے بورنگ والا پانی جو سمبرسبل پمپ (Submersible Pump) کے ذریعے زمین کے اندر سے کھینچا جاتا

ہے، آلودہ ہوا ہے۔ یہ کام ظاہر ہے کہ مقامی سطح پر کام کرنے والے پلمبروں اور نل لگانے والوں نے کیا ہوگا، ہمیں سب سے پہلے اُن سے رابطہ قائم کرنا ہوگا کہ انھوں نے مقررہ اور طے شدہ گہرائی میں ہی بورنگ کیا تھا یا نہیں؟ اُن سے دریافت کرنا پڑے گا کہ جہاں انھوں نے بورنگ کیا تھا۔ وہاں سے سیور لائن کتنی دُور تھی۔ میرا خیال ہے کہ اِنھیں پلمبروں کے ذریعے پائپ لائن ڈیمیج ہوئی ہے۔ جناب ہم نے سارے پلمبروں کے ذریعے پہلے ہی ساری لائن چیک کروالی ہے۔ کہیں کوئی خرابی نظر نہیں آ رہی ہے۔ بلڈر نے اپنی صفائی پیش کی۔ میونسپل کارپوریشن کے چیف انجینئر نے فوراً ہی لقمہ دیا۔ سر، میں نے انجینئروں کی ایک ٹیم وہاں روانہ کی تھی۔ اُن کی رپورٹ کے مطابق پینے کے پانی والی لائن میں کہیں کوئی خامی نہیں ہے، وہ محفوظ ہے۔ ضلع مجسٹریٹ نے بلڈر کی طرف سرد مہری سے دیکھا، پھر کہا۔ آپ اُن سارے نل کا کام کرنے والوں اور پلمبروں کو دوبارہ طلب کیجیے اور محکمۂ صحت کے کارکنوں کی موجودگی میں کل اُن کے ساتھ میٹنگ کیجیے۔ کارپوریٹر صاحب آپ بھی شامل رہیے گا۔ اور ایم.ایل.اے. صاحب کو اگر وقت ملے تو پبلک کا حوصلہ بڑھ جائے گا۔ ایم.ایل.اے. نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ میں ضرور سیوا میں حاضر رہتا مگر کل مجھے راجدھانی جانا ہے۔ وزیر داخلہ نے بلایا ہے۔ کچھ خاص بات کرنے۔ کوئی بات نہیں یہ لوگ دیکھ لیں گے، تو آج کی میٹنگ برخواست میرا مطلب ہے کہ ختم ہوگئی ہے۔ اس کے مِنٹس تیار کرکے ایک گھنٹے کے اندر سارے ممبران تک پہنچا دو۔ ضلع مجسٹریٹ نے اپنے بوڑھے اسٹینو سے کہا جو ایک ماہ پہلے ملازمت سے سبکدوش ہو چکا تھا، مگر ابھی تک کسی نے اُس کا چارج نہیں لیا تھا۔ چائے نہیں آئی ابھی تک۔ ضلع مجسٹریٹ نے تھکی ہوئی آواز میں کہا اور اردلی کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔

میونسپل کارپوریشن کے دفتر کے سامنے مجمع اکٹھا ہونے لگا ہے۔ یہ عجیب دفتر ہے۔ انسانوں کے مرنے جینے کا جتنا حساب کتاب اُس کے پاس ہے اُس سے زیادہ تو بس ملک الموت کے پاس ہی ہوگا۔ اس دفتر میں ایک اندھیرے اور بوسیدہ سے کمرے میں، کسی الماری میں انسانوں کی پیدائش کے ریکارڈ اور سرٹیفکٹ رکھے ہیں اور ایک دوسری الماری میں جو شاید پہلی الماری کے برابر میں ہی رکھی ہوگی اُن کی موت کے سرٹیفیکیٹ ہیں۔ اس الماری پر دھول کچھ زیادہ جمی ہوئی ہے۔ اَب یہ تو وہاں کے کلرک کی راشی آنکھ ہی جانتی ہے یا پھر خدا کی آنکھ کہ کون سی الماری میں زندے بند ہیں اور کون سی میں مُردے۔ ویسے اب نہ زندوں کو مردوں کی فکر ہے اور نہ مردوں کو زندوں کی۔ مردے بے چارے تو پھر بھی کبھی کبھی زندوں کی خیریت دریافت کرنے کے لیے ان کے گھر آجاتے ہیں جہاں سے انھیں بھوت کا لقب دیتے ہوئے ذلیل کر کے نکال دیا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی یہ سوال رہ جاتا ہے کہ وہ الماری کہاں ہے جس میں اُن کے ریکارڈ موجود ہیں جو نہ زندوں میں ہیں اور نہ مُردوں میں۔ مردم شماری کے رجسٹر میں ان کے ناموں کے آگے سرخ روشنائی سے سوالیہ نشان بنا دیا گیا ہے۔ یہ وہ بدنصیب ہیں جو زندہ اور مردہ انسانوں کے درمیان کھنچی گئی ایک سرخ لکیر پر پڑے ہوئے کپکپاتے ہیں۔ کیڑوں مکوڑوں کی طرح۔

لوگ میونسپل کارپوریشن کے دفتر کے آگے اکٹھا ہیں۔ وہ پوچھ رہے ہیں کہ خرابی کب تک دور کی جائے گی۔ مرمت کیوں نہیں کی جارہی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پانی کب تک آئے گا۔ مگر پانی میں جو رمز ہے وہ کارپوریشن کے افسروں کو اور کلرکوں کو نہیں معلوم ہے۔ وہ اس بارے میں جواب دینے سے قاصر ہیں۔

بھیڑ کچہری میں بھی ہے، جہاں کلکٹر بیٹھتا ہے، یعنی ضلع مجسٹریٹ جسے لوگ آج بھی ضلع کا مالک یا بادشاہ سمجھتے ہیں۔ لوگوں کو یقین ہے کہ اُن کے بادشاہ کے پاس اُن کے دُکھوں کا مداوا ضرور ہوگا۔ مگر بادشاہ کا خادم سفید وردی میں ملبوس وہ اردلی بھیڑ کو بار بار پیچھے ہٹنے کا حکم دیتا ہے۔ زیادہ شور پکار مچانے والے چند اولوالعزم افراد کو حراست میں لیے جانے کی دھمکی بھی دیتا ہے مگر ساتھ ہی اُنھیں معنی خیز لالچی نظروں سے دیکھتا بھی جاتا ہے۔
ضلع مجسٹریٹ نے محکمہ حفظانِ صحت کے ڈائریکٹر کو اپنے آفس میں طلب کیا ہے جس کے ریٹائر ہونے میں پندرہ دِن رہ گئے ہیں اور جو دِل کا مریض ہونے کے ساتھ ساتھ بہت نروس قسم کا آدمی ہے۔ اُس کی ہتھیلیاں ہمیشہ پسیجی رہتی ہیں اور پیروں کے تلووں سے آگ نکلتی رہتی ہے۔ اس کا چہرہ ایک مغموم خچر کے چہرے سے مشابہ ہے۔ وہ ضلع مجسٹریٹ کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہے۔ ضلع مجسٹریٹ ایک نوجوان آئی.اے.ایس. آفیسر ہے اور پرانے افسروں کو خاص طور پر وہ جو پرموشن کے ذریعے افسر بنے ہیں، حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک جدید اور اسمارٹ بیوروکریٹ سمجھتا ہے۔ اور پرانی سڑی ہوئی لال فیتہ شاہی کو چمکیلی، نئی اور سبز فیتہ شاہی میں بدل دینا چاہتا ہے۔

ڈی.ایم. صاحب ہیلتھ والوں کے ساتھ میٹنگ کر رہے ہیں۔ بعد میں آپ سب سے بات کریں گے۔ اردلی چلاّتا ہے۔ بھیڑ میں اب اپنا اپنا کیمرہ لیے ہوئے میڈیا کے رپورٹر بھی گھس آئے ہیں مگر اِن میں وہ خوبصورت آنکھوں والی لڑکی نہیں ہے۔ وہ یہاں سے تین کلومیٹر دور ضلع سرکاری اسپتال میں لمبی ناک والے نوجوان ڈاکٹر کے کمرے میں بیٹھی ہوئی

کافی پی رہی ہے۔

آپ کا عملہ اس سلسلے میں کیا کر رہا ہے۔ کمیونٹی ہیلتھ کے نام پر آپ کی کارکردگی کا ریکارڈ گذشتہ بیس سالوں میں مایوس کن رہا ہے۔ ضلع مجسٹریٹ اپنے سامنے رکھی فائلوں کو ٹٹولتے ہوئے کہتا ہے۔ ہم سر ہم، جناب، شہر کے تمام محلّوں اور کالونیوں کی نالیوں میں ہر ہفتے چونا ڈلواتے ہیں اور ملیریا یا ڈینگی کے زمانے میں مٹّی کے تیل اور ڈی.ڈی.ٹی. پاؤڈر کا چھڑکاؤ بھی کراتے ہیں۔ جناب، جی ہاں۔ آپ کو چونا ڈلوانے کے لیے سرکار اِتنی موٹی تنخواہ دیتی ہے؟ نہیں سر۔ جناب، ڈائریکٹر کے ماتھے پر پسینے کی لکیریں بہہ رہی ہیں۔ ضلع کا حاکم ایک فائیل کو دوسری فائیل سے الگ کرتے ہوئے رکھ رہا ہے پھر تیسری کو چوتھی سے لائف اپارٹمنٹس کے معاملے میں آپ کیا کر رہے ہیں؟ ہم، ہم نے جناب ہم نے۔ سر وہاں ہر طرف چونا ہی چونا بکھیر دیا ہے۔ اب ایک مچھر بھی وہاں پر نہیں مار سکتا۔ جناب ڈی.ڈی.ٹی. کا وافر مقدار میں چھڑکاؤ کیا ہے ہم نے جناب۔ اب ایک بھی مچھر۔ ڈائریکٹر نے جلدی جلدی اپنی کارکردگی کا بیان کر دیا ہے۔ تو آپ کے خیال میں یہ بیماری مچھروں کے ذریعے پھیلی ہے۔ ضلع مجسٹریٹ نے سکون آمیز لہجے میں پوچھا۔ جی، جی جناب۔ نہیں، جی نہیں سر۔ مگر مچھروں اور گندگی سے ہی ایسی بیماریاں پھیلتی ہیں جناب۔ میں نے سنا ہے جناب۔ ڈائریکٹر کی آواز لگاتار کپکپا رہی ہے۔ جیسے ریڈیو پر کسی اسٹیشن یا چینل کو سیٹ کرتے وقت اُس کی سوئی کپکپاتی ہے۔ آپ نے سنا ہے؟ آپ میڈیکل جرنلز اور اُن کی تازہ ترین رپورٹوں کا مطالعہ کرتے ہیں؟ کیا آپ میڈیکل کالجوں اور یونیورسٹیز میں منعقد ہونے والے سیمیناروں میں تشریف لے جاتے ہیں۔ ضلع مجسٹریٹ پوچھتا ہے۔ میں جناب، میں دِل کا مریض ہوں اور اگلے ہفتے مجھے پیس میکر لگنے والا ہے۔ ڈائریکٹر نے اپنی پھولتی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔ اوہ! آپ آکسیجن کا سلنڈر ساتھ نہیں رکھتے؟ جی ہمیشہ جناب۔ باہر رکھا ہے۔ آپ کے کمرے کے باہر۔ اردلی نے اندر لے جانے سے منع کر دیا۔ پسینہ

ڈائریکٹر کی گردن پر بہنے لگا۔ دو دن بعد لائف اپارٹمنٹس سوسائٹی میں میونسپل کارپوریشن
کے کارکن، بلڈر کے عملے کے لوگ، پلمبرز اور ایم.ایل.اے. صاحب کی ایک تحقیقاتی
میٹنگ ہوگی۔ آپ کا بھی وہاں رہنا نہایت ضرورت ہے۔ اگر وہاں کی زمین یا پانی میں
بیماری کے جراثیم پائے گئے تو سمجھ لیجئے کہ یہ خطرناک ہوگا اور اُسے دور کرنا ایک ٹیم ورک
ہوگا۔ ہمیں سب کا تعاون درکار ہے۔ آپ بھی اپنی ذمہ داری کو بخوبی سمجھ لیجئے۔ آپ ایک
ماہ بعد ریٹائر ہورہے ہیں۔ ضلع مجسٹریٹ نے کہا۔ جی نہیں سر، پندرہ دن بعد۔ اچھا ریٹائر
ہونے کے بعد کیا ارادہ ہے۔ کوئی بزنس کروں گا۔ بیوی بھی یہی چاہتی ہے اور بچے بھی۔
بہت اچھا خیال ہے۔ ضلع مجسٹریٹ مسکراتا ہے اور کہتا ہے، ضرور بزنس کیجئے۔ چونے کے
ٹھیکے لینا شروع کردیجئے۔ اس میں بڑا منافع ہے۔ جی کیا فرمایا، چوہے کے؟ چوہے کے
نہیں چونے کے۔ ضلع مجسٹریٹ کی مسکراہٹ زہرخند ہوجاتی ہے۔ ڈائریکٹر کا سر ذلّت اور
شرمندگی کے بوجھ کے نیچے دب کر رہ جاتا ہے۔ ضلع مجسٹریٹ گھنٹی بجاتا ہے۔ اردلی اندر آتا
ہے۔ باہر کتنے لوگ ہیں؟ تقریباً ڈیڑھ سو حکم۔ ٹھیک ہے اُن کے صرف دو نمائندوں کا
انتخاب کرکے اندر بھیجو۔ دونوں نمائندے الگ الگ مذہبوں کے ہونا چاہئیں، کیا سمجھے؟
اپنے ساتھ اسٹینو کو بھی لے لو۔ کیا سمجھے؟ جی حکم۔ اردلی واپس جاتا ہے۔ ڈائریکٹر صاحب،
آپ جاسکتے ہیں۔ ضلع مجسٹریٹ نے کہا۔ ڈائریکٹر کانپتے ہوئے پیروں کے ساتھ کرسی سے
اُٹھتا ہے۔ ضلع مجسٹریٹ اردلی کو بلانے کے لیے دوبارہ گھنٹی بجاتا ہے۔ اردلی اندر آتا
ہے۔ کافی بھیجو، بہت گرم کافی۔ ضلع مجسٹریٹ اُس کی طرف دیکھے بغیر حکم دیتا ہے۔

چشمہ لگائے، خوبصورت آنکھوں والی رپورٹر نوجوان ڈاکٹر کے کمرے میں بیٹھی ہوئی کافی
کے گھونٹ لے رہی ہے۔ ڈاکٹر اُسے رومانی نظروں سے دیکھنے کے باوجود اُس پر ادب کے
کسی جغادری پروفیسر کی طرح اپنے مطالعے کا رعب ڈالنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔

آپ نے Illness as Metaphor پڑھی ہے؟ ڈاکٹر پوچھتا ہے۔ نہیں، کس
نے لکھی ہے؟ سوزن سوتانگ نے۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ اچھا میں نے یہ نام پہلی بار سنا
ہے۔ لڑکی بولی۔ اوہ! بڑے افسوس کے بات ہے کہ آپ سوزن سوتانگ کو نہیں جانتی ہیں۔
ڈاکٹر نے افسوس اور ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ پھر فخریہ انداز میں بولا۔ میں میڈیکل
کالج کے لٹریری اور ڈرامہ کلب کا جنرل سکریٹری تھا۔ خیر آپ نے آر. اِسٹیون کا The
Paradox Plant تو پڑھا ہوگا۔ وہ تو بیسٹ سیلر رہا ہے۔ خوبصورت آنکھوں والی لڑکی
اپنے سیاہ ریشمی بال اوپر جھٹکتی ہے۔ دھیرے سے، ادا کے ساتھ مسکراتی ہے اور کہتی ہے۔
نہیں میں نے اس کتاب کا نام سنا ہے۔ چلیے کوئی بات نہیں، مگر میرے خیال میں آپ کو پہلی
ہی فرصت میں The Emperor of All Maladies پڑھ لینا چاہیے۔ اگر آپ کو
جیسا کہ آپ نے بتایا کہ آپ کو بیماری اور اُس کی سماجیات یعنی سوشیولوجی سے بہت دلچسپی
ہے۔ ڈاکٹر نے جوشیلے انداز میں جملہ مکمل کیا۔ جی، میں نے یہ کتاب پڑھی تو نہیں ہے مگر
اِس کے بارے میں بہت سنا ہے۔ سدھارتھ بنرجی نے لکھی ہے نا؟ جی نہیں بنرجی نہیں
چٹرجی۔ ڈاکٹر نے تصحیح کی۔ ہاٹ کیک کی طرح بکتی ہے یہ کتاب، مزہ آجائے گا پڑھ کر۔
ڈاکٹر نے کچھ اس انداز میں کہا جیسے وہ کوئی پورنوگرافی کی کتاب ہو۔ خیر میں آپ کو دوں گا۔
گھر آیئے گا کبھی۔ بہت کتابیں دوں گا اور ہاں میں آپ کو میتھوٗ جون اسٹون کی I Had a
Black Dog بھی دینا چاہوں گا۔ آپ کافی اور لیں گی؟ جی ضرور۔ مجھے کافی بہت پسند
ہے۔ لڑکی مسکرائی۔ مجھے کافی سے زیادہ کافی کی خوشبو پسند ہے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ پچھلے سال
یورپ گیا تھا، وہاں کی لڑکیاں اپنے پرس میں اور اپنی جیبوں میں برازیلین کافی کے بیج رکھتی
ہیں۔ کافی کی مہک سے زیادہ اچھی کسی پرفیوم یا عطر کی مہک بھی نہیں ہوسکتی۔ اُس کی مہک
میں ایسا کیا ہے؟ لڑکی اپنی نیل پالش کریدتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ وہ دراصل بے حد
سیکسی ہوتی ہے۔ نوجوان ڈاکٹر نے اتنی تیزی کے ساتھ کہا کہ وہ لفظ سیکسی پر اتنا زور نہیں

دے پایا جتنا اِس موقع پر اُسے دینا چاہیے تھا مگر اِس سے پہلے کہ اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو پاتا۔ لڑکی نے اُس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ اپنا جملہ ادا کیا۔ آپ کا مطلب 'ہاٹ' سے ہے نا۔ سیکسی کا لفظ پرانا ہو چکا۔ کم سے کم پانچ سال پرانا۔ ہم میڈیا والے لفظوں کو ہمیشہ اُن کے صحیح تناظر میں استعمال کرتے ہیں۔ ہمیں اس کی ٹریننگ دی جاتی ہے کہ ہم عصریت سے الفاظ کا رشتہ کبھی منقطع نہ ہو پائے۔ ڈاکٹر پہلی بار کچھ جھینپ جاتا ہے۔ پھر اِس جھینپ کو مٹانے کے لیے پوچھتا ہے۔ تو آپ نے بیماریوں پر کون سی کتابیں پڑھ رکھی ہیں؟ میں نے اور کافی منگوائی ہے۔ شکریہ۔ جب میں کالج میں پڑھتی تھی تو وہاں کے تقریباً ہر طالب علم کے ہاتھ میں مارکیز کی Love in the Time of Cholera ہوا کرتی تھی۔ مجھے بھی پڑھنا پڑی۔ اُسی زمانے میں البیئر کامیو کی پلیگ کا مطالعہ بھی کیا۔ اور ہاں یاد آیا، چین کا ایک مصنف تھا لی یان، اُس کے ناول Ding کے بھی صفحات پڑھے تھے مگر آگے نہیں پڑھ پائی۔ دل نہیں لگا۔ لڑکی اپنی لپ اسٹک درست کرنے لگتی ہے جو زیادہ شوخ رنگ کی نہیں تھی اور اُس کی بھوری آنکھوں سے مطابقت رکھتی تھی۔ ڈاکٹر نے غیر ارادی طور پر اپنے نچلے ہونٹ پر زبان پھیری اور لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا، مگر یہ سب تو ناول ہیں۔ ناول میں ہوتا ہی کیا ہے۔ جھوٹ اور لفّاظی کے علاوہ۔ اتنا جھوٹ بکتے ہوئے اُن پر بجلی کیوں نہیں گرتی۔ اِن سے وقت گزاری اور تفریح بازی کے علاوہ کوئی سنجیدہ مقصد نہیں حاصل ہوسکتا۔ آپ علمی اور تحقیقی کتابیں پڑھا کریں۔ دراصل مجھے لٹریچر کی کوئی سمجھ نہیں۔ آپ نے پوچھا تو بتا دیا۔ لڑکی نے کہا۔ ویسے آپ کو یہ ناول کیسے لگے تھے؟ ڈاکٹر نے پوچھا۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ لڑکی بولی۔ وہی تو، وہی تو۔ ڈاکٹر خوش ہو کر کہنے لگا۔ آپ بجائے ناول پڑھنے کے ناول پر لکھی تنقیدی کتابیں پڑھ لیا کیجیے۔ اُن کو پڑھ کر آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ ناول نگاروں سے زیادہ احمق اور کوئی قوم نہیں ہوتی اور ناول سے زیادہ فحش اور مخرّب اخلاق کوئی شے نہیں ہوتی۔ چپراسی کافی کے دو کپ ٹرے میں رکھے ہوئے داخل ہوا مگر اُس کے

پیچھے ایک نرس اور وارڈ بوائے بھی تھے۔ کیا بات ہے؟ ڈاکٹر نے پوچھا۔ ایک مریض اور چل بسا ہے۔ وارڈ کا ماحول بہت بگڑ گیا ہے۔ نرس نے جواب دیا۔ اوہ، اچھا! ٹھیک ہے۔ تم چلو، میں کافی ختم کر کے آتا ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا۔ نرس کنکھیوں سے لڑکی کی طرف دیکھتی ہوئی، وارڈ بوائے کے ساتھ واپس چلی جاتی ہے۔

کیا میں بھی آپ کے ساتھ وارڈ میں چل سکتی ہوں؟ لڑکی نے پوچھا۔ میرے خیال میں شاید یہ مناسب نہ ہو۔ میڈیا کے لوگوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے بے چارگی کا اظہار کیا۔ میں بس میڈیا کی رپورٹر ہی ہوں؟ خوبصورت آنکھوں والی لڑکی نے پتہ نہیں کس ترکیب سے اپنی آنکھیں اور خوبصورت اور نشیلی بنا لیں۔ اُس نے لپ اسٹک لگے ہوئے اپنے اُبھرے اُبھرے ہونٹ کچھ اس انداز میں آگے بڑھائے جس سے یہ پتہ لگانا مشکل تھا کہ وہ ڈاکٹر کو بوسہ دینا چاہتی ہے یا اُس کا بوسہ لینا چاہتی ہے۔ ڈاکٹر کی سانسیں تیز ہو گئیں۔ اچھا میں کوشش کرتا ہوں۔ تم اپنا کیمرہ تو ساتھ نہیں لائی ہو؟ اس نے کہا۔ نہیں۔ یہ اچھا ہے۔ چلو پھر جلدی سے کافی ختم کریں۔ ڈاکٹر یہ کہتا ہوا کافی کا کپ ہاتھ میں پکڑے ہوئے اُٹھ کر میز کی دوسری طرف لڑکی کی کرسی کے قریب آ گیا۔ لڑکی نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر کافی کا ایک لمبا گھونٹ لیا۔ ڈاکٹر نے اپنا کپ میز پر رکھ دیا۔ لڑکی نے بھی اپنا کپ میز پر رکھ دیا۔ لڑکی کے کپ پر لپ اسٹک کا نشان آ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اُس نشان کو غور سے دیکھا۔ پھر وہ لڑکی کے اور قریب آ گیا۔

ایمرجنسی وارڈ کے اندر ایک عورت بُری طرح چیختی تھی، روتی تھی۔ اپنے سینے پر دوہتّھر مارتی تھی۔ اُس کے تین سال کے معصوم بچے کی لاش ابھی بھی بیڈ پر موجود تھی۔ جس پر لال کمبل ڈال دیا گیا تھا۔ اس کے برابر میں چار پلنگ اور پڑے ہوئے تھے۔ سامنے بھی، دوسری قطار میں پانچ پلنگوں پر مریض لیٹے ہوئے تھے۔ مگر اس سے ہمیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ

ایمرجنسی وارڈ میں صرف دس ہی مریض تھے۔ دراصل پلنگوں کی اور جگہ کی کمی ہونے کے باعث ایک پلنگ پر دو مریض لٹائے گئے تھے۔ یوں دیکھا جائے تو وارڈ میں بیس افراد بھرتی تھے جن میں سے فی الحال ایک مر چکا تھا۔ مریضوں کی تعداد میں لگاتار اضافہ ہورہا تھا۔ چیف میڈیکل آفیسر کی ہدایت کے مطابق ان مریضوں کو صرف ایمرجنسی وارڈ میں ہی رکھا جاسکتا تھا۔ ان تمام مریضوں سے علیحدہ اور الگ جو دوسری بیماریوں اور دوسری وجوہات کی بنا پر اسپتال میں بھرتی تھے یا جن کے بھرتی ہونے کے امکانات تھے۔ دوسری طرف۔ شہر کے پرائیویٹ اسپتالوں اور نرسنگ ہوموں نے بھی ایسے کسی مریض کو اپنے یہاں بھرتی کرنے سے منع کردیا تھا۔ جو لائف اپارٹمنٹس سے آئے ہوں مگر اب تو ایسی خبریں بھی ملنی شروع ہوگئی تھیں کہ یہ بیماری محض لائف اپارٹمنٹس تک ہی محدود نہیں رہ گئی تھی۔ صورتِ حال کی نزاکت اور سنگینی کو دیکھتے ہوئے ایمرجنسی وارڈ کے باہر ایک طویل اور گوتھک طرز کی بنی ہوئی تقریباً سنسان سی رہنے والی راہداری میں بھی مریضوں کے لیے پلنگ بچھا دیے گئے تھے۔ یہاں بھی ایک پلنگ پر دو مریض۔ دونوں مریضوں کے جسم میں چڑھائی جانے والی گلوکوز اور سیلائن کی بوتلیں اور نلکیاں آپس میں اُلجھ اُلجھ جاتیں، ٹکراتی رہتیں۔ وہ تڑپتے اور بار بار پیٹ میں اُٹھنے والے بھیانک نامعلوم درد کے سبب سے ایک دوسرے کی طرف بے چین ہوکر کروٹیں بدلتے اور ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ جاتے۔ اُن کے ہاتھوں اور پیروں کی اُنگلیاں ایک دوسرے کی انگلیوں میں پھنس پھنس جاتیں۔ انجکشن کے واسطے اُن کی کلائیوں اور پنڈلیوں میں پیوست سوئیاں بار بار بند ہوجاتیں۔ بوتلوں کی نلکیوں میں ہوا بھر جاتی جس کے سبب اُن کے جسم سے خون نکل نکل کر دوسروں کے کپڑوں اور چہروں پر لگ جایا کرتا۔ وہ درد سے بے حال ہوکر اس طرح چلاّتے جیسے ذبح ہوتے ہوئے جانور۔ کبھی کبھی تو کروٹیں لینے میں وہ پلنگ سے نیچے بھی گر جایا کرتے اور اُن کے جسم کے کسی حصے کی ہڈّی ٹوٹ جایا کرتی۔ وہ اپنی دیکھ بھال کرنے والے تیمارداروں کے بس میں نہ آتے

تھے۔ یوں بھی وارڈ میں ایک مریض کے ساتھ صرف ایک تیماردار ہی رہ سکتا تھا۔ کبھی کبھی بات بے بات پر ایک پلنگ کے دونوں طرف کھڑے تیماردار ایک دوسرے سے لڑنا بھی شروع کردیتے تھے۔

اِن بدنصیب مریضوں کو کسی حال چین نہ تھا۔ اُن پر نہ تو درد کم کرنے کے انجکشن اثر کرتے اور نہ ہی نیند لانے والے انجکشن۔ وارڈ میں بے حد گندگی پھیلی ہوئی تھی اور بے حد سڑاندھ بھی۔ وارڈ کا تمام عملہ اگرچہ ماسک لگائے ہوئے تھا اور دستانے پہنے ہوئے تھا، پھر بھی بدبو تھی کہ چلی آتی تھی۔ وہ ماسک کے باریک ریشوں کی دیوار کو توڑ دیتی تھی اور ناک میں دُرّانہ وار گھسی آتی تھی۔ ناک بند کرلینے اور سانس روک لینے پر بھی اس بدبو کی آہٹ کو صاف محسوس کیا جاسکتا تھا۔ بے چارے صفائی کے عملے پر شاید ہی کبھی اِس سے زیادہ برا وقت پڑا ہو۔ اُن کے دستانے ہر وقت خون ملی ہوئی اُلٹیوں اور زرد گندگی سے آلودہ رہتے تھے۔ اُن کی بالٹیاں اس گندگی سے لبالب بھر چکی تھیں مگر اب اسپتال میں ایسی کوئی جگہ بھی باقی نہیں بچی تھی جہاں یہ بالٹیاں خالی کی جاسکتیں۔ فنائل اور ڈیٹول کا اسٹاک ختم ہوچکا تھا۔ صابن اور پونچھے کے کپڑے اب باقی نہ رہے تھے۔

وہ سب چلاّ رہے تھے۔ مریض ہی نہیں، لاشوں کے وارث ہی نہیں بلکہ وارڈ بوائے، صفائی کا کام کرنے والے اور نرسیں تک سب حیوانوں کی طرح چیخ رہے تھے مگر پھر بھی ہر ایک کی چیخ پر ایک خاموشی حاوی تھی۔ لاشوں کی خاموشی اور موت کے سنّاٹے نے وہاں عورتوں کے بَین کو بھی ایک کمزور آواز میں بدل کر رکھ دیا۔ جب تین سال کے اُس بچّے کی لاش کو بستر سے اُٹھا کر باہر لایا جانے لگا تو اُس پلنگ پر اُس کے برابر لیٹے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے مردہ بچّے کے لال کمبل کو پوری طاقت کے ساتھ پکڑ لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بچّے کی لاش وہاں سے ہٹائی جائے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ ایسا وقت بھی آسکتا ہے۔ جب لاشیں زندوں کو خوف زدہ کرنے کے بجائے اُن کی ڈھارس بندھاتی

پھریں۔ خاص طور پر وہ زندے جن کے جلد ہی لاشوں میں تبدیل ہونے کے امکانات
ہوں اس کوشش میں بچّے کے گلے میں پڑی ہوئی، تعویذ کی کالی ڈوری ادھیڑعمر شخص کے ہاتھ
میں پھنس گئی۔ بچّے کی ماں دلخراش چیخیں مار رہی تھی۔ جب وارڈ بوائے نے کسی نہ کسی طرح
بچّے کی لاش کو اُٹھا کر باہر اسٹریچر پر ڈال دیا تو ماں اُس کے پیچھے پیچھے اِس طرح بھاگ رہی
تھی جیسے بلّی اپنے بچّے کو خطرے میں دیکھ کر اُسے بچانے کے لیے دیوانہ وار بھاگتی ہے۔
وارڈ کے باہر پھیلا ہوا پیلا غبار اُسی طرح اپنی جگہ قائم تھا۔ وہ وارڈ کے شیشوں سے چھن چھن
کر اپنا عکس مریضوں اور اُن کے بستروں پر ڈال رہا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ سب یرقان زدہ
نظر آتے تھے۔ اُن کے بستروں کی سفید چادریں تک زرد دکھائی دیتی تھیں۔ پورا شہر بخار
کے اس غبار میں جل رہا ہے اور کپکپا رہا ہے۔ بخار کا یہ منحوس بادل، یہ پیلا مٹیالا بادل، اپنی
جگہ سے ہلتا نہیں۔ اِدھر اُدھر جنبش تک نہیں کرتا۔ آسمان اِس زرد دھند کے بادل میں منڈھ
کر رہ گیا ہے۔ اِس بادل میں جراثیم ہی جراثیم ہیں۔ کالے سفید کپڑے پہنے ہوئے، کریہہ
بدصورت جوکروں کی طرح ایک دوسرے کے منہ پر طمانچے مارتے ہوئے۔ وائرس اور
جراثیم بھیس بدل بدل کر آتے ہوئے جاتے ہوئے۔ وہ انسان کو کسی درخت، گھاس یا
پودے سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔ کچھ بھی نہیں۔

سنہری فریم کا چشمہ لگائے اُس خوبصورت آنکھوں والی لڑکی نے اپنے چہرے پر ماسک
لگا لیا ہے اور ہاتھوں میں دستانے پہن لیے ہیں۔ وارڈ کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی
اُسے چکّر آنے لگا ہے۔ نوجوان ڈاکٹر مریضوں کا معائنہ کر رہا ہے۔ وہ ڈیوٹی پر موجود جونیئر
ڈاکٹر سے پوچھتا ہے۔ مریضوں کے ناخن آپ نے دیکھے؟ یس سر، جونیئر ڈاکٹر نے جواب
دیا۔ کوئی خاص بات نوٹ کی آپ نے؟ جونیئر ڈاکٹر تھوک نگل کر رہ جاتا ہے۔ سب کے
ناخن ٹیڑھے ہو کر اوپر کی طرف مڑ رہے ہیں۔ نوجوان ڈاکٹر نے فاتحانہ نظروں سے لڑکی کی

طرف دیکھا جو گھبرائی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ اوہ یس سر، یس سر۔ جونیئر ڈاکٹر نے جواب دیا۔
بچّے کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے جائے گی اور اَب تک جتنے لوگوں کی اموات ہوئی ہیں اُن
کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹیں سی.ایم.او. صاحب کے دستخط کے ساتھ فوری طور پر انسٹی ٹیوٹ
آف وائرلوجی اور مائیکرو بیالوجی سینٹر کو روانہ کی جائیں گی۔ کیا سمجھے۔ جی سر۔ جونیئر ڈاکٹر
نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ناخنوں کا ٹیڑھا ہونا پُراسرار ہے۔ یہ صرف مہلک قسم کے
زہر کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اگر یہ بیکٹیریا ہے تو بھی اور وائرس ہے تو بھی۔ مگر ناخن
ٹیڑھے نہیں ہو سکتے اور دیکھئے یہ پیلے پڑ کر ٹیڑھے ہو رہے ہیں۔ پیلے ہی ہو رہے ہیں یا
خون کی کمی ہے یا اس کمبخت پیلی دُھند کا اِن پر عکس پڑ رہا ہے۔ یہ پیلی آندھی یہاں آ کر کب
سے رُکی کھڑی ہے۔ اس نے تو یہیں خیمہ ڈال لیا ہے اور ہاں سنئے۔ انسٹی ٹیوٹ آف ٹاکسی
لوجی کو بھی رپورٹ بھیجئے۔ ڈاکٹر نے اپنی بات ختم کی ہی تھی کہ نرس دوڑتی ہوئی آئی۔ سر، وہ
اُدھر باہر راہدری میں ایک کی حالت بگڑ رہی ہے۔ دونوں ڈاکٹر اور نرس راہداری میں آتے
ہیں۔ خوبصورت آنکھوں والی لڑکی پیچھے ہے۔

اٹھارہ اُنیس سال کے ایک نوجوان کے منہ سے خون کی لکیر بہتی ہوئی ٹھوڑی تک آ رہی
ہے۔ آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھ گئی ہیں۔ وہ بے ہوش ہے یا پھر مر رہا ہے۔ بلڈ پریشر ناپا
کتنا ہے؟ ڈاکٹر نے نرس سے پوچھا۔ 300/160۔ یہ بہت ہے۔ دماغ کی رگ پھٹ
گئی۔ یہ دیکھئے اس کے بھی ناخنوں کا وہی حال ہے۔ ٹیڑھے ہو کر آسمان کی طرف جا رہے
ہیں۔ ڈاکٹر مریض پر جھکتا ہوا کہتا ہے۔ مجھے بچا لو، ارے کوئی مجھے بچا لو۔ میں مرنا نہیں
چاہتا۔ اِسی بیڈ پر نوجوان کے برابر میں لیٹا ہوا ایک سِن رسیدہ داڑھی والا آدمی رو رو کر کہنے
لگا۔ روئی لاؤ، خون صاف کرو۔ جوان آدمی ہے، بہت خون باہر آئے گا۔ روئی کا اسٹاک ختم
ہو گیا ہے ڈاکٹر۔ نرس کہتی ہے۔ باہر سے منگواؤ۔ جی ڈاکٹر۔ آرڈر دے دیا گیا ہے مگر سپلائی

نہیں ہو پا رہی ہے۔ تو کوئی کپڑا لاؤ۔ پٹّی لاؤ۔ اب ناک سے بھی خون نکلنا شروع ہو گیا ہے۔ نوجوان کے منھ اور ناک سے بہتا ہوا خوان، برابر میں لیٹے ہوئے سِن رسیدہ داڑھی والے شخص کی پسلیوں کو بھیگونے لگا۔ اُس نے گھبرا کر دوسری طرف کروٹ لینی چاہی تو اسٹینڈ پر لگی ہوئی گلوکوز کی بوتل نکل کر فرش پر گر کر ٹوٹ گئی۔ اس زبردست جھٹکے کے باعث سوئی بھی اُس کی کلائی سے نکل کر گوشت پھاڑتی ہوئی، دونوں مریضوں کے سروں پر ڈولنے لگی۔ کچھ دیر کے لیے ایسا لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ اب داڑھی والے کی کلائی سے بھی خون کا فوّارہ پھوٹ پڑا۔ بستر کی سفید چادر میں اُن دونوں کے خون گھل مل کر رہ گئے۔

مجھے چکّر آ رہا ہے، سارا جسم سُن ہو گیا ہے۔ خوبصورت آنکھوں والی لڑکی دھیرے سے کہتی ہے۔ بس یہاں سے نکل رہے ہیں۔ مجھے سی. ایم. او. سے ملنا ہے۔ ڈاکٹر نے بھی بہت آہستہ سے جواب دیا۔ پھر بلند لہجے میں نرس سے کہا۔ اسپتال میں خون تو وافر مقدار میں موجود ہے۔ جی نہیں سر، اسٹاک ختم ہو گیا ہے۔ میڈیکل ایسوسی ایشن کے بلڈ بینک سے منگواؤ۔ ڈاکٹر نے برہمی کے ساتھ کہا۔ جی سر، وہاں بھی اسٹاک ختم ہو گیا ہے۔

اسپتال کی راہداری سے نکل کر، وہ نیچے اُترنے والی سیڑھیاں طے کرتے ہیں۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر لڑکی کا پیر پھسلتا ہے۔ ڈاکٹر اُسے سہارا دیتے ہوئے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ یہ چیف میڈیکل آفیسر کے بنگلے تک جانے والا ایک شارٹ کٹ ہے۔ درختوں سے گھرا ہوا ایک سنسان راستہ۔ پیڑوں پر بیٹھے ہوئے کچھ کوّے، اُن کے سروں پر کائیں کائیں کر رہے ہیں۔ اِدھر کوئی آتا جاتا نظر نہیں آتا۔ بائیں طرف مڑ کر اسٹاف کے چند چھوٹے چھوٹے کوارٹر ہیں جن کی طرف ایک عورت دودھ کی بالٹی لیے ہوئے جا رہی ہے۔ ایک بھوری بلّی نے اُن کا راستہ کاٹا ہے۔ سامنے گھنے درختوں کا ایک جھنڈ ہے جس کے عقب میں تھوڑے فاصلے پر اسپتال کا وہ پچھلا چھوٹا سا گیٹ ہے جو مقررہ وقت میں صرف

اسٹاف کے لیے ہی کھولا جاتا ہے۔ درختوں کے جھنڈ کے نیچے پہنچ کر، اچانک ڈاکٹر، لڑکی کو پوری طاقت کے ساتھ اپنی بانہوں میں جکڑ لیتا ہے۔ وہ لڑکی کے ہونٹوں کا بوسہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ لڑکی اپنا سر پیچھے کی طرف کرتی ہے۔ ڈاکٹر کی لمبی ناک کا بانسہ لڑکی کے چشمے سے ٹکراتا ہے۔ چشمہ آنکھوں سے پھسل کر زمین پر گر جاتا ہے۔ وہ چشمہ اُٹھانے کے لیے نیچے جھکتی ہے تو اُس کے گہرے کٹاؤ والے جمپر میں سے چھوٹے چھوٹے پستان اپنی آدھی جھلک دِکھانے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر، اُسے سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے ہونٹ اُس کے سینے کے قریب لے آتا ہے۔ پیڑوں پر بیٹھے کوّے زور زور سے بولتے ہیں۔

نہیں، آج نہیں۔ مجھے اُلٹی آ رہی ہے۔ بہت زور کی اُلٹی۔ لڑکی گھبرائی اور کانپتی ہوئی آواز میں دوبارہ کہتی ہے۔ میرا جی مِتلا رہا ہے۔ وہ وہیں زمین پر اُکڑوں بیٹھ جاتی ہے اور سر جھکا کر قے کرنے کی کوشش میں اُبکائیاں لیتی ہوئی کھانسنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر اُس کی پیٹھ سہلانے لگتا ہے اور اُس کے بریسیئر کے سخت ہُک کو بھی۔ میں نے سخت منع کیا تھا وارڈ میں جانے کو۔ عام آدمی یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ابھی ٹھیک ہو جاؤ گی۔ نہیں زبردستی اُبکائیاں مت لو۔ حلق چھل جائے گا۔ ڈاکٹر کہتا ہے اور اپنی پتلون کی جیب میں سے وٹامن سی کی گولیاں نکالتا ہے۔ لو یہ دو گولیاں منھ میں رکھ لو اور گہری گہری سانسیں لو۔

کچھ دیر بعد لڑکی اُٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ پسینے سے اُس کا چہرہ بھیگا ہوا ہے اور لپ اسٹک بگڑ گئی ہے۔ جسے وہ ٹھیک کرتی ہوئی کہتی ہے۔ میں جاؤں؟ اِدھر پچھلے گیٹ سے ہی باہر نکل جاؤں؟ اچھا ٹھیک ہے، میں اپنی کار سے تمھیں چھوڑ دیتا مگر آج سی. ایم. او. کے یہاں ضروری میٹنگ ہے۔ ابھی تمام ڈاکٹروں کو اِس میں شرکت کرنا ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے۔ نہیں شکریہ، میں چلی جاؤں گی۔ کل کافی پینے کہیں باہر چلتے ہیں۔ دو بجے کے بعد میری ڈیوٹی ختم ہو جائے گی۔ ڈاکٹر مسکرا کر کہتا ہے۔ میں فون پر بتا دوں گی، رات میں او کے۔ اور

ہاں وہ سوزن سونٹاگ کی کتاب لینے گھر کب آؤ گی؟ جلد ہی آؤں گی۔ کتاب کا نام یاد ہے نا؟ ڈاکٹر پوچھتا ہے۔ Illness as Metaphor لڑکی جواب دیتی ہے۔

لڑکی اسپتال کے پچھلے دروازے سے باہر چلی جاتی ہے۔ ڈاکٹر چیف میڈیکل آفیسر کے بنگلے کی جانب قدم بڑھانے لگتا ہے۔ اُس کا سفید کوٹ، اچانک نہ جانے کہاں سے بھٹک آئے ہوئے ہوا کے ایک جھونکے سے لہرانے لگتا ہے۔ صرف ایک پَل کے لیے۔ شاید وہ جھونکا ایک دھوکہ تھا۔ پیلے غبار نے سورج کو پوری طرح ڈھک لیا ہے۔ دھند کچھ اور گاڑھی ہوئی ہے۔ غبار میں کچھ نئی پرتیں شامل ہوئی ہیں۔ ایمرجینسی وارڈ کے علاوہ ہر طرف خاموشی ہے۔ دوسرے قسم کے مریض یہاں آنے سے ڈر رہے ہیں۔ جب بھری دوپہر میں یہ سنّاٹا ہے تو شام ڈھل جانے کے بعد یہاں کیسا لگے گا۔ رات میں جب اسپتال کی راہداریوں میں کتّے گھومیں گے اور آوارہ بلّیاں روئیں گی۔ وہ اُس مَوت کو دیکھ کر روئیں گی جو وہاں آرام سے چہل قدمی کر رہی ہے۔ انسان مگر مَوت سے ڈرتے تو ہیں مگر اُس کے قدموں کی حقیقی چاپ نہیں سن سکتے۔

معاملہ اب واقعی لائف اپارٹمنٹس تک ہی محدود نہ رہا تھا۔ جلد ہی دوسری کالونیوں سے بھی گھروں میں گندا پانی آنے اور وہاں کے باشندوں کے بیمار پڑ جانے کی خبریں آنے لگیں۔ خبریں صرف مقامی اخبارات کی سرخیاں ہی نہیں تھیں بلکہ قومی سطح کے اخبارات بھی یہاں کی خبریں شائع کرنے لگے۔ صوبائی وزارتِ صحت نے شہر کے اعلیٰ حکام کو طرح طرح کی ہدایات دینی شروع کر دیں۔ لوگ ان کالونیوں سے نکل نکل کر جانے لگے۔ عالم یہ ہوگیا کہ ستّر سے اسّی فلیٹوں پر مشتمل ہر سوسائٹی میں محض دس یا پندرہ فلیٹ ہی ایسے بچے ہوں گے جن میں ابھی بھی لوگ رہ رہے تھے اور اُنھیں یہ توقع تھی کہ جلد ہی یہ بلا ٹل جائے گی۔ اِدھر آ کر گرمی بھی بڑھ گئی تھی۔ ہوا بند تھی، اِس لیے حبس بہت ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ اِس لیے بھی یہاں سے نہیں ہٹنا چاہتے تھے کہ اُن کے گھروں میں تمام سہولتیں میسر تھیں۔ سب سے بڑھ کر نعمت تو ایئر کنڈیشنڈ تھے تو آخر اُنھیں دیواروں سے اُکھڑوا کر کہاں لے جایا جا سکتا تھا اور کس کے گھر میں۔

ایک تبدیلی یہ بھی واقع ہوئی تھی کہ اچانک اس علاقے میں ایمبولینسوں کی آوازیں زیادہ آنے لگیں تھیں۔ آٹو رکشہ یا ٹیکسی وغیرہ مشکل سے ہی نظر آتی تھیں۔ آدھی رات میں جب ایمبولینس سائرن دیتی ہوئی گزرتی تو کتّے اُس کی لال عقبی روشنی پر بھونکنے لگتے۔ اِس

تماشے کو چلتے ہوئے ڈیڑھ ہفتہ ہو چکا تھا۔ دوسرے ہفتہ کے آخری دنوں میں اِس تمام علاقے میں پینے کے پانی کی سپلائی بند کر دی گئی۔ یہ قدم سینٹر فار ڈیزیز کنٹرول کے مشورے پر اُٹھایا گیا تھا۔ ویسے تو اس مسئلے کے حوالے سے شہر میں تقریباً روزانہ ہی اعلیٰ حکام کی میٹنگیں ہو رہی تھیں جن میں ڈاکٹروں کے علاوہ سول انجینئر بھی شامل رہتے تھے۔ مگر اِس ہفتے یہاں کی مٹّی اور زیرِ سطح آب کی جانچ پرکھ کرنے کے لیے انسٹی ٹیوٹ آف سوائل ریسرچ والوں کی ایک ٹیم بھی دارالحکومت سے آ پہنچی۔ اس ٹیم کے ساتھ جیولوجیکل سروے کے دو سائنسداں بھی موجود تھے۔ یہ کوئی عام بات نہیں تھی۔ میڈیا نے اِسے بہت سنجیدگی سے لیا تھا۔ یہ جل بورڈ کے انجینئروں، میونسپل کارپوریشن کے افسروں اور سیاست دانوں کی موشگافیوں سے کہیں بڑھ کر تھی۔ اس ٹیم نے متاثر علاقے اور اُس کے آس پاس کی زمین کھودنی شروع کر دی۔ کھودی گئی مٹّی کے ڈھیر اونچے ہوتے جاتے تھے۔ مٹّی کے اِن اونچے ڈھیروں پر چیل اور کوؤں نے آ کر بیٹھنا شروع کر دیا۔ یہ ٹیم دس افراد پر مشتمل تھی اور اپنے ساتھ زمین کھودنے والی جدید ترین مشینیں اور کئی طاقت ور جنریٹر بھی ساتھ لائی تھی۔ یہ قدرے حیرت کی ہی بات تھی کہ ایک چھوٹے سے نظر انداز کر دیے جانے والے شہر کے ایک مخصوص علاقے میں پانی سے پھیلنے والی ایک بیماری کو روکنے یا اُس کی وجہ کی کھوج بین کرنے کے لیے یہ اقدام نہ صرف صوبائی سطح پر بلکہ مرکزی حکومت کے احکام کے تحت اُٹھائے جا رہے تھے۔ مقامی سیاست دان اس کا سہرا اپنے سر لے رہے تھے کیونکہ اس علاقے میں ایک بائی الیکشن بھی ہونا تھا جس کا دن قریب آ رہا تھا۔

مرنے والوں کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹیں اور مریضوں کے خون کی جانچیں پابندی کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ آف وائرلوجی کو بھیجی جا رہی تھیں مگر ابھی تک تو کوئی نتیجہ سامنے آیا نہیں تھا اور اگر آیا تھا تو ظاہر ہے کہ اُسے خفیہ رکھا جا رہا تھا۔ جو بھی ہو رہا تھا اور جو بھی سننے میں آ رہا تھا وہ طرے طرح کے اندیشوں اور وہموں کا ایک طویل سلسلہ بن کر رہ گیا تھا۔ اخبارات

میں پورے پورے صفحوں پر ایسے اشتہار شائع کیے جا رہے تھے جو عام دنوں میں نظر نہیں آتے۔ مثلاً ان حقائق کی تشہیر کی جا رہی تھی کہ حفظانِ صحت کا خیال رکھتے ہوئے سائنس نے بہت سی خطرناک بیماریوں کو جڑ سے ختم کر دیا ہے۔ مختلف قسم کی دوائیاں، سرجری کے نئے آلات، مشینیں، سی.ٹی. اسکین، ایم.آر.آئی اور بھی بہت سی ایسی ریڈیائی مشینیں جن کے ذریعے کینسر جیسے موذی مرض تک پر قابو پا لیا گیا ہے۔ زراعت کے میدان میں بھی کیمیاوی کھادیں، دوائیں اور مخلوط یا دونسلی بیجوں کے ذریعے نہ صرف فصل کی پیداوار بڑھی ہے بلکہ بنجر اور ریتیلی زمین بھی کاشت کے قابل ہو گئی ہے۔ اناج، پھل اور سبزیوں میں پہلے سے کئی گنا زیادہ پیداوار ہونے لگی ہے مگر ایک منفی پہلو بھی سامنے آیا ہے اور وہ یہ کہ ماحول میں آلودگی بڑھتی جا رہی ہے۔ اقوامِ متحدہ کے ماحولیاتی پروگرام کے تحت آلودگی کے بارے میں لگاتار اعداد و شمار فراہم کیے جا رہے ہیں اور ایشیائی ممالک اس خطرے سے کچھ زیادہ ہی دوچار ہیں۔ ہوا تو آلودہ ہوتی ہی ہے مگر سب سے زیادہ خطرہ پانی کے آلودہ ہو جانے کی وجہ سے درپیش ہے اور زیرِ زمین پانی کی سطح نہ صرف کم ہوتی جا رہی ہے بلکہ زہریلی بھی۔ یہ بھی ممکنات میں سے ہے کہ کبھی آگے چل کر پانی کے ذخیرے ختم ہو جائیں۔ ملک کے کئی صوبوں میں پانی کی تقسیم پر آپس میں تنازعہ چل رہا ہے اور ممکن ہے کہ اگر تیسری عالمی جنگ ہوئی تو وہ صرف پانی کے ذخائر پر قبضہ کرنے کی نیت سے ہوگی۔ اِن اشتہارات میں آج کل روز ہرے درختوں کو کاٹنے سے منع کیا جاتا ہے اور یہ آگاہ کیا جاتا ہے کہ ہرے جنگلوں اور درختوں کو کاٹنا اور وہاں کارخانے اور فیکٹریاں قائم کرنا ایک جرم ہے۔ ماحول کو آلودگی سے بچانے کے لیے حکومت نے بہت سے اقدام اُٹھائے ہیں، جن کی اطلاع عام آدمی تک پہنچانا بہت ضروری ہے۔ یہ اقدام اب قوانین کے درجہ تک پہنچ گئے ہیں اور اِن کا نفاذ نہ صرف ریاستی حکومتوں بلکہ مرکزی حکومت کے ذریعے بھی کیا جا رہا ہے۔ ان میں فیکٹری ایکٹ، ماحولیاتی ایکٹ اور قانون برائے آبی آلودگی شامل ہیں۔ آلودگی کو کنٹرول میں رکھنے

کے لیے باقاعدہ طور پر ایک بورڈ کی تشکیل بھی کی گئی ہے جس کی سفارشات پر حکومت کے ذریعے عمل کیا جانا لازمی ہے۔ اس طرح کے اشتہارات نہ صرف اخباروں میں بلکہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر بھی نشر کیے جا رہے ہیں۔ دیواروں پر پوسٹر بھی لگائے جا رہے ہیں۔ یہ اچھی علامتیں نہیں ہیں۔ یہ کسی بڑے خطرے کا پیش خیمہ ہیں۔ حد ہو گئی کہ اچھی صحت کو برقرار رکھنے کے پرانے اور فرسودہ اُصول بھی دہرائے جانے لگے ہیں۔ ورزش کرنا، صبح کا ٹہلنا، متوازن غذا، وقت کی پابندی وغیرہ کے فوائد اور شراب نوشی یا سگریٹ نوشی کے مُضر اثرات گنوائے جا رہے ہیں۔ تازہ پھل اور سبزیاں کھانے پر زور دیا جا رہا ہے اور گوشت خوری سے ہونے والے نقصانات کے بارے میں ہدایتیں دی جا رہی ہیں۔ حفظانِ صحت کے تمام اُصول رٹائے جا رہے ہیں جبکہ محکمۂ حفظانِ صحت کا سربراہ اِن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور عوام اس قسم کے اشتہارات پر اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی مگر سب سے بڑا اندیشہ تو اُس وقت دل میں گھر کر جاتا ہے جب اخبارات کے ان اشتہاروں میں یہ سطر بھی دیکھنے کو مل جاتی ہے کہ ''یاد رکھیے! پاک وصاف پانی کا نہ تو کوئی رنگ ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی مزہ اور خوشبو۔'' کاش یہ بھی بتا دیا جاتا کہ ہائیڈروجن گیس کے دو سالمے، آکسیجن گیس کے ایک سالمے سے ملنے کے بعد جو شے بناتے ہیں وہ پانی کہلاتی ہے۔ پڑوسی ملک کے سائنس دانوں نے پانی کی اِس تعریف میں ایک جملے کا اخلاقی اور مذہبی اضافہ بھی کر لیا ہے۔ اُن کے مطابق اِن دونوں گیسوں کے سالمے جب تک آپس میں مل ہی نہیں سکتے جب تک انھیں ملانے میں خدائی مرضی شامل نہ ہو۔ شاید اس لیے چاند پر پانی شروع شروع میں دریافت نہیں کیا جا سکا اگرچہ وہاں آکسیجن بھی تھی اور ہائیڈروجن بھی مگر یہ دونوں گیسیں چاند پر الگ الگ آزاد حالتوں میں تھیں۔ خدا کی مرضی نہیں تھی کہ دونوں ملیں جس طرح اگر خدا کی مرضی نہ ہو تو مجال ہے کہ دو محبت کرنے والے دِل بھی مل سکیں۔ (مگر اب چاند پر پانی دریافت کر لیا گیا ہے یہ بھی خدا کی مرضی ہے)

پتہ نہیں اس قسم کے اشتہارات بچکانہ ہیں یا کسی حملہ آور فوج کے آگے آگے دوڑتے ہوئے ڈھول بجا بجا کر آنے والی موت سے خبردار کرنے والے بھانڈ اور مسخرے۔ یہ اس سے زیادہ اور کیا خبر دے سکتے ہیں یا اس کے علاوہ اور کیا بتا سکتے ہیں کہ صاف پانی کا نہ کوئی رنگ ہوتا ہے نہ مزہ اور نہ کوئی خوشبو، اگر خدا چاہے تو۔

Water is a lot like people
Not every person is drinkable
Some people carry demons
Youc an not rip them off
People can cause damage like other
Some say, that lonliness is killer.
Water is a lot like love
Love causes destruction
Love is different tempratures
Love is antidote to pain and the virus itself
So when you reach the end of your Journey
Remember water and all of its different forms
Remember the abuse
Remember the revival
Because it is all there
We simply do not look close enough.

Authentic

تم نے دریائی گھوڑے کی آنکھیں دیکھی ہیں
شاید نہیں
زمین سے عجیب کوئی سیارہ نہیں
پانی زمین کا بچّہ ہے
ہم سب مٹّی کی کھاٹ پر لیٹے سو رہے ہیں
کھاٹ کے نیچے
فنا کا پانی ہے
ندی جب چاہے اپنی راہ بدل لیتی ہے
مگر زمین اور آسمان کو
تقسیم کر دینا
یہ بدسلیقگی ہے
دریائی گھوڑے نے کہا
میں تو تمھارے گھر مچھلیاں کھانے نہیں آ سکتا
مگر پانی آ سکتا ہے جس میں میرا گھر ہے

دریائی گھوڑے کی اُداس آنکھوں میں
جلے ہوئے وصیت ناموں کی راکھ تھی
زمین کے اندر پانی نے کہا
میں بھی اُدھر ہی چل رہا ہوں
مجھے ماں کی دی ہوئی بددُعائیں یاد ہیں

خالد جاوید

اتنی بات تو ہر کوئی جانتا ہے کہ زندگی کی شروعات پانی سے ہوئی ہے۔ چار سو سال قبل مسیح یونان کے مشہور فلسفی تھیلس نے تو پانی کو ہی حقیقت مطلق قرار دے دیا تھا۔ مگر زندگی کے ساتھ ساتھ پانی موت اور فنا کی بھی علامت ہے۔ زمین پر پانی کے مقابلے خشکی کا حصہ صرف ایک تہائی ہی ہے۔ انسانی جسم کا ستر فیصد حصہ پانی ہی ہے۔ قدیم یونان میں پانی کو ایک عظیم دیوتا کا درجہ دیا گیا تھا اور بعد میں جل پری، بنت البحر، آبی حسینہ اور شریر آبی بونے کی ایجاد بھی کر لی گئی تھی۔ وہ مقدس مقامات جہاں دیوتا پیش گوئیاں کرتے تھے، دریاؤں کے کنارے ہی واقع تھے۔ ان کی قدیم عبادت گاہیں اور پرانے بڑے گرجا گھر بھی پانی کے ہی قریب تعمیر کیے گئے تھے اور آج بھی بپتسمہ کی رسم پاک وصاف پانی کے ذریعے ہی ادا کی جاتی ہے۔ پانی اگرچہ رقیق مادہ ہے مگر درجۂ حرارت کی مناسبت سے ٹھوس مادے میں بھی بدل سکتا ہے اور گیس یا ہوا بن کر اڑ بھی سکتا ہے۔ پانی کی مبادیات اتنی آسان نہیں۔ مگر دورِ حاضر میں (1988) فرانس کے ایک سائنس دان ژاک بین وِن نے ہومیوپیتھی کے علاج کے تعلق سے پانی کے بارے میں ایک عجیب وغریب نظریہ پیش کیا۔ ژاک بین وِن کا کہنا تھا کہ پانی کی اپنی ایک باقاعدہ یادداشت بھی ہوتی ہے۔ اِس تھیوری کے مطابق پانی میں جو مادہ بھی گھولا جاتا ہے پانی اُسے بھولتا نہیں، یاد رکھتا ہے۔ اگر کسی مادّے کو پانی

میں بار بار تحلیل کیا جاتا رہے، یہاں تک کہ جب اُس مادّے کا کوئی بھی سالمہ پانی میں باقی نہ رہے اور پھر اِس پانی کو جب کسی دوسرے صاف پانی میں ملایا جائے تو وہی مادّہ اپنے کچھ سالموں کی شکل میں اُس صاف پانی میں دوبارہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ہومیو پیتھک دوائیاں اسی عقیدے کی بنا پر بنائی جاتی ہیں۔ سائنس دانوں کی ایک بڑی جماعت نے بین وِن کے نظریہ کو قبول نہیں کیا ہے مگر اِس موضوع پر مزید تحقیق جاری ہے۔

دنیا کے ہر مذہب میں پانی کو ایک پاک صاف اور روحانی شے مانا گیا ہے۔ پانی سے بہت سی بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ جگہ جگہ ہائیڈرو تھراپی سینٹر کھل گئے ہیں۔ ہندوستان میں بہت سی ندیوں کو پوتر مانا گیا ہے جن میں دریائے گنگا کو اوّلیت حاصل ہے کہ اُس میں نہا لینے سے انسانوں کے پاپ اور اُن کے سارے برے افعال مٹ جایا کرتے ہیں۔ گنگا میں نہانے کے بعد وہ اتنے ہی مقدس ہو جاتے ہیں جتنے کہ وہ تب تھے جب اپنی ماں کے پیٹ سے اُن کا جنم ہوا تھا۔ ہر گندی شے پانی سے ہی پاک ہوتی ہے۔ پانی ہی ہے جو وقت کی طرح بہتا ہے اور پانی ہی ہے جو سر سے اونچا ہو جائے تو موت کو وہاں اپنے پیر جمانے میں بڑی سہولت مل جاتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ پانی پر دُعائیں پڑھ پڑھ کر دَم کی جاتی ہیں اور کبھی کبھی بددُعائیں بھی۔ پانی سب یاد رکھتا ہے۔ ساری دُعاؤں اور بددعاؤں کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ وہ بولے گئے لفظوں کو اپنی یادداشت سے کبھی باہر نہیں جانے دیتا۔ اُس کا حافظہ دائمی ہے۔ اُس میں نقش اور تعویذ گھول کر بیماروں کو پلائے جاتے ہیں اور کبھی کبھی محبوب کو اپنے بس میں کرنے کے لیے یا اُس کا دِل کسی کی طرف سے پھیر دینے کے لیے۔ لفظ پانی میں تحلیل ہو جانے کے بعد ہی امر ہوتے ہیں۔ ورنہ لغات کے اوراق میں پڑے سڑتے رہتے ہیں، کفن اوڑھے ہوئے۔ لفظ ہمیشہ ذاتی اور نجی ہوا کرتے ہیں۔ انسان اِن مُردوں کا عرس مناتا ہے۔ لفظ انسانوں کے ہاتھ آتے ہی بھوت بن جاتے ہیں۔ بھوت زیادہ تر کینہ پرور ہوتے ہیں۔ لفظوں نے دنیا کو تباہ کر ڈالا اور پانی، الفاظ اور اُن کی صوتیات

کی ملی جلی سازش کا سب سے بڑا شکار بنا۔ شاید اِسی لیے شِو دیوتا کو سمندر کے سارے پانی کا منتھن کر کے اس سے امرت نکالنا پڑا تھا اور وہ رقص 'تانڈو' کرنا پڑا تھا جس میں لفظ نہیں ہوتے۔ اس لیے اس رقص کے کوئی معنی بھی نہیں ہوتے۔ یہ اس دنیا کے فنا ہونے کی ایک شکل ہے۔ پانی کوئی مستقل مقام یا مکان نہیں گھیرتا وہ بہتا ہے ہر مقام سے وہ وقت، کال، زمانہ اور مَوت کو اپنے سیّال کندھوں پر لیے ہوئے گھومتا رہتا ہے۔ وہ پُراسرار حد تک پاکیزہ اور خطرناک حد تک تباہ کن ہے۔

مگر پانی ہی گندا ہو گیا۔ پانی کیسے گندا ہو گیا۔ پانی کو گندا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ گندا پانی گھروں میں چلا آ رہا ہے۔ یہ ذلیل کر رہا ہے۔ یہ گھٹیا غلیظ پانی جس میں انسانوں کے جسموں کے مَیل کے ساتھ اُترا ہوا صابن، جھاگ، پیشاب کی کھراند اور انسانی فضلے کی دبیز زرد پرت کے ساتھ ایک بھیانک بدبو ہے۔ یہ وہ پانی نہیں جسے دیکھ کر کتّے کا کاٹا ڈر جایا کرتا ہے۔ یہ وہ پانی ہے جسے دیکھ کر انسان پاگل کتا بن جاتا ہے اور خود بھی سڑتے ہوئے بدبودار پانی میں بدل جاتا ہے۔ جو ٹونٹی کھولو تو یہی سڑاندھ بھرا پانی باہر نکلتا ہے۔ وہ جس شے کو چھو لیتا ہے اُسے بھولتا نہیں۔ وہ اپنے اوپر دم کیے ہوئے کینہ پرور جذبوں کو بھی نہیں بھولتا اور اُن گناہوں کو بھی جنھیں اُس نے دھو کر پاک کیا تھا۔

اب وہی گناہ، پانی انسانوں کو واپس کر رہا ہے۔ انسان ہونے کی مجبوریاں ہی انسان کے اصلی اور ازلی گناہ ہیں اور وہی اِس کینہ پرور پانی نے اپنے اندر جذب کر رکھے ہیں۔ آج وہ انسانوں کو ان کے گناہ لوٹا رہا ہے کچھ اِس روپ میں کہ اب ان گناہوں کو پانی سے دھویا بھی نہیں جا سکتا۔

پانی کی سپلائی نا جانے کب سے بند ہے مگر وہ غرّا رہا ہے۔ زمین کے نیچے سیور لائن کے ٹوٹے، کالے اور مہیب پائپوں میں، ٹنکیوں میں، ٹونٹیوں میں۔ آسیب زدہ پانی زمین کے نیچے لہراتا ہے اور زمین کے اوپر زہریلی دُھند اور پیلا غبار پیدا کرتا ہے۔

دور کسی اسپتال کے ویران گلیاروں میں عورتوں کے بَین کرنے کی آوازیں اُبھرتی ہیں۔ اس بَین میں آوارہ بلّیوں کے رونے کی دردناک آوازیں بھی شامل ہیں۔ یہ بلّیاں کرائے پر نہیں بلکہ بَین کرنے والی عورتوں کے لیے مفت میں حاصل ہو جانے والی رودالیاں ہیں۔

لائف اپارٹمنٹس اور اُس کے آس پاس کی دوسری کالونیوں میں پانی کی سپلائی مکمل طور پر روک دی گئی۔ جل بورڈ والوں نے پانی کے ٹینکر وہاں لے جا کر کھڑے کر دیے مگر اتنے بڑے رقبے میں پانی کے محض دو ٹینکر ناکافی تھے۔ وہ اپنے اپنے برتن اور بالٹیاں لیے ہوئے ٹینکر کے سامنے قطار بنا کر کھڑے ہو گئے مگر یہ قطار انسانوں کی تھی چیونٹیوں کی نہیں کہ زیادہ دیر برقرار رہتی۔ اِس لیے ایک گھنٹے کے اندر ہی وہاں حشر کا سامان برپا ہو گیا۔ وہ قطاریں توڑ کر ٹینکر کی ٹونٹیوں پر جھپٹنے لگے۔ وہ ایک دوسرے کو دھکّے دے رہے تھے۔ گالیاں بک رہے تھے۔ عورتیں تو بری طرح شور مچا رہی تھیں۔ کسی نے کسی کے سر پر بالٹی دے ماری۔ کوئی زمین پر گر پڑا تھا اور اُس کی بالٹی ٹوٹ گئی تھی۔ آہستہ آہستہ زیادہ تر کی بالٹیاں اُلٹ گئیں۔ صرف نچلی منزل پر رہنے والے اپنی بالٹیوں کو حفاظت کے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہوئے۔ زمین پر کیچڑ اور پھسلن ہو گئی تھی۔ اِس افراتفری میں وہ پھسل پھسل کر گرنے لگے۔ چوٹیں کھانے لگے۔ اُن کے گھٹنوں اور کہنیوں سے خون نکلنے لگا۔

سب سے بڑی مصیبت اُن بوڑھوں کی تھی جو اکیلے رہتے تھے۔ اُنھیں پانی کی ایک بوند بھی نہ مل سکی۔ کالونیوں میں رہنے والے کچھ زیادہ ہی صاحبِ حیثیت لوگوں نے آرڈر دے کر منرل واٹر کے جار اور بوتلیں منگوانا شروع کر دیں۔ دو دِن بعد یہ ہوا کہ کئی منرل واٹر

کمپنیوں نے اِدھر آ کر وقتی طور پر کیمپ لگائے اور اپنی اپنی ایجنسیاں کھول لیں۔ آپس میں مقابلہ آرائی شروع ہوگئی۔ کولڈ ڈرنک بنانے والی کمپنیاں بھی اِس دوڑ میں کیوں پیچھے رہتیں۔ آخر کولڈ ڈرنک میں پانی تو ہوتا ہی ہے۔ اس وقت تو اگر وہاں خون بھی فروخت کیا جاتا تو وہ بھی کم پڑ جاتا۔ خون میں بھی آخر پانی تو ہے ہی۔ کولڈ ڈرنک کے مختلف برانڈوں کے اشتہارات دیواروں پر چسپاں نظر آنے لگے۔ جس میں فلم اسٹاروں اور کھلاڑیوں کی، ایسی تصویریں نظر آنے لگیں جن میں وہ ایک خاص برانڈ کی بوتل منھ میں لگائے ہوئے نروان حاصل کر رہے تھے۔

آندھی کو پتہ نہیں کس نے اپنی جھاڑو سے کاٹ دیا تھا کہ وہ اپنے پیلے غبار کے ساتھ یہیں رُکی کھڑی تھی۔ اس شدید حبس اور گرمی سے اور پیاس سے تڑپتے ہوئے، کالونی کے باشندوں کو کولڈ ڈرنک کی کتنی ضرورت ہوگی اور اُن کے بچے کتنے خوش ہوئے ہوں گے، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

کمپنیاں تین ہی دن میں مالا مال ہوگئیں۔ اُنھیں سپلائی دینا مشکل ہوگیا۔ دوسرے شہروں سے پانی کی بوتلیں اور کولڈ ڈرنک لادے ہوئے چھوٹے ٹرک ہر وقت آتے جاتے دکھائی دینے لگے۔ مگر ان ٹرکوں کے ساتھ ساتھ اِن اطراف میں ایمبولینسوں کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی۔ تقریباً ہر فلیٹ سے کوئی نہ کوئی، روز ہی اسٹریچر پہ لیٹا ہوا اور ایمبولینس میں ڈال کر لے جایا جاتا ہوا نظر آنے لگا۔

مگر دنیا اتنی بلیک اور وہائٹ نہیں ہے کہ سکھ اور دُکھ کے راستے آسانی سے الگ الگ پہچانے جاسکیں۔ جہاں یہ دونوں دھارائیں ملتی ہیں وہاں ایک نیلا بونڈر ہے جس کے پار دیکھا نہیں جاسکتا۔ دنیا اتفاق سے رنگین ہے۔ رنگ ہمیشہ مخمسے میں ڈالتے ہیں۔ اس لیے دنیا معمہ ہے۔

چنگی کے الیکشن قریب آ رہے تھے۔ سیاسی پارٹیوں نے اپنی تگ ودو شروع کر دی۔ ہر

پارٹی کا اُمیدوار اس بیمار علاقے کے مسیحا کے روپ میں سامنے آنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہر پارٹی کے کارکن حکام کے دفتروں کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھ گئے اور پانی پانی کے نعرے لگانے لگے۔ ٹیلی ویژن والوں کی بھی چاندی ہوگئی تھی۔ اُنھیں کچھ اور نہیں ملا تو وہ ماضی میں پھیلنے والی وباؤں کی تاریخ دہرانے لگے۔ مثلاً کالی موت اور پلیگ کس کس زمانے میں پھیلے تھے اور کتنی اموات ہوئی تھیں۔ اسپینی انفلوئینزا نے کب اور کتنے لوگوں کو ہلاک کیا تھا۔ چیچک نے کیا قیامت ڈھائی تھی اور سب سے بڑھ کر کالرا نے اور پھر پرندوں اور سُوروں میں پھیلنے والے فلیو نے وغیرہ وغیرہ۔ وہ یہ بھی اطلاع فراہم کرنے لگے کہ تحریک خلافت کے دوران مہاتما گاندھی کو بھی اسپینی فلیو ہوگیا تھا جس کے سبب یہ تحریک وقت سے پہلے ہی کچھ کمزور پڑ گئی تھی اور یہ بالکل اُسی طرح تھا جیسے کسی مشہور فلمی ہیرو کی موت کے موقع پر ٹیلی ویژن پر نہ صرف اُس کی فلمیں دکھائی جاتی ہیں بلکہ اُن ہیروئنوں کے چہرے بھی دِکھائے جاتے ہیں جن کے ساتھ اُس ہیرو نے کام کیا تھا۔

کچھ دنوں بعد اس علاقے میں دودھ والوں نے آنا بند کر دیا۔ شاید اِس وجہ سے کہ کچھ لوگوں نے اُن پر دودھ میں گندا پانی ملانے کا الزام لگایا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ ایک افواہ ہو مگر افواہوں کی اپنی ایک سماجیات بھی ہوتی ہے۔ افواہیں گرم تھیں۔ اُن کے پَر نکل آئے تھے اور وہ اُڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جایا کرتی تھیں۔ مثلاً کولڈ ڈرنک اور پانی کی بوتلوں میں بھی گندے پانی کا استعمال کیا جا رہا تھا اور میونسپل کارپوریشن کے ٹینکروں میں بھی۔ یہ بھی اُڑتے اُڑتے سنا گیا کہ یہ وائرس اب شہر کے دوسرے حصوں میں بھی پھیل گیا ہے۔ ایک ٹی.وی چینل، جو ہمیشہ بھوت پریتوں کے قصے سناتا اور بے پَر کی اُڑاتا رہتا ہے، نے تو حد ہی کر دی۔ اُس نے ایک رپورٹ نشر کی جس کے مطابق ان کالونیوں کے باشندے کولڈ ڈرنک کی بوتلوں کا استعمال حوائج ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد خود کو صاف کرنے کے لیے کر رہے ہیں۔ اس رپورٹ کے نشر ہوتے ہی بازار میں ٹوائلٹ پیپر ملنا

دشوار ہوگیا۔ٹوائلٹ پیپر بنانے والی کمپنیوں کے سیلز مین ہر کالونی کے باہر خوانچے والوں کی طرح صدائیں لگا لگا کر ٹوائلٹ پیپر بیچنے لگے۔ایک ایسے بھیانک وائرس کے وجود میں آنے کی افواہ گشت کرنے لگی جو پانی سے پیدا ہوتا تھا۔زمین اور اُس کی مٹّی میں گھومتا تھا اور ہوا میں اُڑتا تھا۔اُس کا وزن زیادہ تھا اس لیے ہوا میں آ کر دھوپ کی گرمی سے متاثر ہو کر بے ہوش ہو جاتا تھا۔اس وائرس کے شکار ہونے والے کو جو کوئی بھی چھو لیتا تھا وہ بھی اِس بیماری میں مبتلا ہو جاتا تھا۔اس وائرس کا علاج کچھ نہ تھا،سوائے ایک ذلیل موت کے۔

مگر ہمیں افواہوں کو اتنی غیر سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے۔افواہیں اپنے حصے کا سچ گہرے راز کی طرح محفوظ رکھتی ہیں۔جس طرح اونٹ اپنے کوبڑ میں پانی کو محفوظ رکھتا ہے۔افواہیں دراصل اُن رنگ برنگی تتلیوں کی طرح ہوتی ہیں جنہیں پکڑ لینے کے بعد اُن کے پروں کا رنگ ہماری اُنگلیوں میں چپک جاتا ہے۔ایک نا قابل یقین رنگ۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف وایرولوجی کے سائنس دان اس وائرس کے کوڈ کو کریک نہیں کر سکے۔بس اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ کبھی یہ وائرس کی طرح حرکت کرتا نظر آتا ہے اور کبھی بیکٹیریا کی طرح۔وائرس بیکٹیریا سے بھی بہت چھوٹے خوردبینی اجسام ہوتے ہیں۔کچھ بیکٹیریا انسان کے دوست اور اُن کے لیے مفید بھی ہوتے ہیں مگر وائرس کبھی کسی کا دوست نہیں ہوتا۔وہ انسان کو پیڑ پودوں اور گھاس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا۔وہ اپنے آپ کو پروٹین کی ایک دبیز چادر میں چھپائے رکھتا ہے۔وائرس طفیلی اجسام ہیں۔اُن کو اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے دوسرے زندہ خلیوں کی ضرورت رہتی ہے۔ان کی درجہ بندی نہ تو نباتات میں کی جا سکتی ہے اور نہ ہی حیوانات میں۔ان دونوں کے درمیان واقع ہونے پر یہ کبھی کسی طرح کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور کبھی کسی طرح کا۔وائرس ہجڑوں کی طرح پُر اسرار اور نا قابلِ یقین ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان پر اینٹی بائیوٹک دواؤں کا اثر نہیں ہوتا کیونکہ اُن میں اُس قسم کی جان ہے ہی نہیں جو کبھی جسم میں ہونے کی توقع کی جاتی ہے۔کونسل فار میڈیکل ریسرچ ابھی اس وائرس کے لیے کوئی دوا تجویز نہیں کر سکتی۔جہاں تک ویکسین کا سوال ہے تو اُس کے بارے میں بھی تحقیق کی جا رہی ہے۔ویکسین کا تعلق جسم کے مدافعتی نظام سے ہوتا ہے۔نہ کہ دوا کے ذریعے کیے جانے والے علاج سے۔اس تحقیقی کام میں کونسل فار میڈیکل ریسرچ کے

ساتھ سینٹر فار سیلولر اینڈ مولیکولر بیالوجی، کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ اورمرکزی حکومت کا ڈپارٹمنٹ آف بایوٹیکنالوجی بھی شامل ہیں۔انسٹی ٹیوٹ آف سوائل ریسرچ کی ٹیم بھی اپنی تحقیق میں کچھ نہیں پاتی۔اس کی رپورٹ صرف یہ تھی کہ اس علاقے کی مٹّی چکنی اور جڑی ہے۔جسے دومٹ مٹّی بھی کہتے ہیں۔یہ مٹّی پوری طرح سے صاف اور قطعی غیر آلودہ ہے۔یہاں کے کھیتوں سے اُگائے جانے والی گیہوں، چاول اور دالوں کی فصل ملک کے دوسرے خطوں کی فصل سے زیادہ صحت مند، تغذیہ بخش اور صاف ستھری ہے۔ یہاں کے باغات اور گنّے اور کپاس کی پیداوار بھی قابلِ رشک ہے۔فصلوں اور پیڑ پودوں کو لگنے والی بیماریاں برائے نام ہیں۔مہلک حشرات کش کی تعداد بھی مٹّی میں تناسب یا اعتدال سے زیادہ نہیں ہے۔کوئی بھی وائرس یا جراثیم ایک دن میں پیدا نہیں ہوسکتا۔اُس کے اندر سالہا سال پرانے ڈی.این.اے. اور آر.این.اے. کی پرتیں موجود ہوتی ہیں۔یہ اُس زمانے سے موجود ہیں جب آدمی غاروں میں رہا کرتا تھا۔یہ جراثیم اور وائرس بھی غاروں میں موجود تھے،کبھی چمگادڑوں میں بطور طفیلی رہ کر اور کبھی سانپ بچھوؤں میں۔اس علاقے کی مٹّی میں کسی قسم کے خطرناک یا پُر اسرار خوردبینی اجسام نہیں پائے گئے ہیں۔

جیولوجیکل سروے کرنے والی ٹیم نے زمین کے اندر بہت گہرائی میں موجود پانی کا معائنہ کیا اور پایا کہ زیرِ زمین پانی کی سطح، اس پورے رقبے میں پوری طرح صاف اور بے ضرر ہے مگر آس پاس خشک چٹانیں موجود ہونے کی وجہ سے، جو قدیم ترین اراولی پہاڑوں کی نشانیاں ہیں۔پانی میں کیلشیم، میگنیشیم اور سوڈیم کی تعداد کچھ زیادہ ہے مگر وہ خطرناک آلودگی کے زمرے میں نہیں آتی ہے۔پانی میں کسی بھی قسم کی بیماری پھیلانے والے اجسام نہیں پائے گئے ہیں۔

اسی طرح مٹّی پر ریسرچ کرنے والوں، پانی کا معائنہ اور اُس کا علاج کرنے والوں اور سول انجینئروں، سب نے اس معاملے سے اپنا اپنا پلّہ جھاڑ لیا۔

اب صرف اس بات کا انتظار ہے کہ وائرس ہو یا جو بھی اَلا بَلا ہو، مریضوں کے خون کی جانچ میں اُس کا بغور مطالعہ اور مشاہدہ کب تلک کیا جائے گا اور کس نتیجے تک کب تک پہنچا جائے گا۔اس سلسلے میں ممکن ہے کہ ملک کے تحقیقاتی اداروں اور لیبارٹریز کو باہری ممالک سے مدد مانگنا پڑے۔ہماری مشینیں اور دوسرے آلات اتنے جدید نہیں ہیں۔دیکھا جائے تو سائنسی تحقیق کا معیار ہی یہاں تسلّی بخش نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ ملک کے بڑے بڑے دماغ وطن چھوڑ کر ترقی یافتہ ملکوں کی راہ لیتے ہیں اور پھر انھیں کی خدمات کے لیے ہمیشہ کے لیے وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

لیکن یہ سب بہت آئیڈیل بیان ہے اور اس کا کوئی تعلق بدنصیب انسانوں کے مصائب اور مسائل سے نہیں ہے۔یہ سب رواداری کی باتیں ہیں اور سیاسی رنگ سے رنگی ہوئی بھی ہیں۔اس رنگ کے علاوہ بھی دنیا میں بہت رنگ ہیں۔ہر تماشے، ہر کھیل اور ہر فلم کا اپنا ایک رنگ ہوتا ہے۔ان رپورٹوں اور اخباری بیانات سے الگ، وہاں انسانوں کی اصل دنیا میں ایک دوسرا تماشہ چل رہا ہے۔

قیامت تو گویا اُس دن آ گئی جب اِس خبر کو سرکار کی طرف سے مستند قرار دے دیا گیا کہ نہ صرف لائف اپارٹمنٹس اور اُس کے نواحی علاقوں میں بلکہ شہر کے دوسرے حصوں میں بھی اِس وائرس سے متاثر مریض پائے گئے ہیں۔ سرکار نے اس سلسلے میں ایک وہائٹ پیپر بھی جاری کر دیا جس میں اِس سنگین مسئلے سے نپٹنے اور لڑنے کے لیے اُٹھائے جانے والے اقدامات اور اُن کے جواز کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا تھا۔ حالات اب اِس درجے تک بگڑ چکے تھے کہ اسپتالوں کے ڈاکٹر اور نرسیں بھی بیماری کی زد میں آ چکے تھے۔ یہی نہیں خون اور پیشاب وغیرہ کی جانچ کرنے والی لیبارٹریز کا عملہ بھی بیمار پڑنے لگا لہٰذا اب اِس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں بچی تھی کہ یہ ایک بہت ہی خوفناک اور چھوت چھات سے پھیلنے والی بیماری تھی جو ایک انسان سے دوسرے انسان تک بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پہنچ سکتی تھی۔ ایک رپورٹ کے مطابق ایک شخص سے دوسرے شخص تک پہنچنے میں اسے صرف گیارہ سیکنڈ لگتے تھے۔ حالت یہ تھی کہ اس انتخابی حلقے کا ایم.ایل.اے. تک بخار، دستوں اور اُلٹیوں میں مبتلا تھا۔ ضلع کا حاکم آئی.اے.ایس.، میونسپل کارپوریشن کا چیف انجینئر، محکمہ ہیلتھ کا ڈائریکٹر، شہر کا میئر اور وہ بلڈر بھی۔ کون تھا جو اِس بیماری کی زد میں نہیں آ گیا تھا۔ یہ خطرناک تو تھا ہی مگر کچھ کچھ مضحکہ خیز بھی۔ اب سب کو یقین آ گیا تھا کہ یہ بری طرح پھیلنے والی وَبا ہے۔ اسی

لیے کتوں اور بلّیوں نے رات میں، آسمان کی طرف منھ اُٹھا اُٹھا کر پہلے ہی سے رونا شروع کر دیا تھا۔ جو لوگ ابھی اس بلا کی زد میں نہیں آئے تھے، انھوں نے ردِ بلا کی دُعائیں پڑھنا اور ایک دوسرے کو بھیجنا شروع کر دیں۔ بہت سوں نے صدقے دینا شروع کر دیے۔ اتنی بڑی تعداد میں جان و مال کے صدقے دیتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ ایسا نظر آنے لگا جیسے صدقہ دینے والوں کا ایک میلہ لگا ہوا ہے جس طرح گاؤں میں ہفتہ بازار لگتے ہیں اور اُن میں جگہ جگہ گیہوں، چاول اور چنے کے اونچے اونچے ڈھیر لگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر اُنھیں نہیں معلوم کہ خدا کے فیصلے انسانوں کے فیصلوں سے یکسر مختلف ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تو بالکل ہی مخالف۔ خدا کے بھید خدا ہی جانتا ہے یا وہ جو اُس جیسا ہو۔

اُدھر اسپتالوں میں مرنے والوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ لاشوں کے پہلے تو پوسٹ مارٹم کیے جاتے اور پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر شراب کے نشے میں چور ہو کر، مگر پھر بھی ڈرے اور سہمے ہوئے مُردہ جسموں پر اپنے بُغدے چلاتے۔ جب لاشیں اُن کے لواحقین کے سپرد کر دی جاتیں تو اُنھیں تجہیز و تکفین کے لیے گھر نہیں لے جایا جاتا بلکہ اسپتال سے سیدھے، ایمبولینس میں ڈال کر قبرستان یا شمشان گھاٹ پہنچا دیا جاتا جہاں اُنھیں دفنانے یا نذرِ آتش کرنے میں بہت دقّتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ضروری ارکان پورے کرنے کے لیے ملّا، مجاور یا پنڈت کو دس گنا زیادہ رقم ادا کرنا پڑتی کیونکہ کوئی بھی بیماری کے پوٹ بنے مردہ جسم کو نہ تو غسل دینا چاہتا تھا اور نہ ہی ہاتھ لگانا۔ اس لیے کم سے کم ارکان میں ہی کام چلایا جانے لگا۔ لوگ کسی اور وقت مرنے کی دُعائیں مانگنے لگے۔ وہ اس وبا میں مر کر اپنی لاشوں کی ایسی بے عزّتی اور بے حرمتی نہیں کرانا چاہتے تھے۔ مگر کیا یہ صرف لاشوں کی بے عزّتی تھی۔ نہیں سب سے بڑھ کر تو یہ موت کی بے عزّتی تھی۔ موت جو اتنی شیخی خور واقع ہوتی تھی۔ لوگ جس سے ڈرتے تھے، مگر احترام بھی کرتے تھے۔ آج اتنی خوار ہو کر گلیوں گلیوں بھٹک رہی تھی اُس کی اوقات اُس معمولی چور کی طرح ہو گئی تھی جو کسی کے گھر میں نقب

لگانے سے پہلے، کئی دن پہلے سے اُس گھر کے چاروں طرف گھومتا رہتا ہے۔محل و وقوع کا جائزہ لینے کے لیےاور ماحول کو دیکھنےاور سمجھنے کے لیے کبھی کبھی بھیک مانگنے کے بہانے چور گھر کے دروازے سے اندر ہی چلا آتا ہے۔ تا کہ دیکھ سکے کہ کون سا کمرہ کہاں ہےاور وہ جگہ کہاں ہوسکتی ہے جہاں مال چھپا کر رکھا گیا ہوتا۔ بالکل اسی طرح چھپ چھپ کر مَوت بھی گھر دیکھنے آنے لگی۔ کبھی بیماری کے بہانے، کبھی خودکشی کے بہانے اور کبھی قتل کے بہانے۔مَوت بری طرح ذلیل ہورہی تھی۔لوگ اُس پر تھوکتے تھے۔اورجسم

جسم کو تو روح نے اپنی بنائی ہوئی خوفناک اندھیری جیل میں قید کر کے ڈال رکھا ہے۔ نہ جانے کب سے روح خود تو ہر تماشے سے ماورا تھی مگر سرکس کے تنبو کے سارے بانس جسم میں ہی گڑے ہوئے تھے۔ انسانی جسم ہی ہر ڈرامے کا اسٹیج بنتا آیا ہے۔ سارا کھیل جسم کی سرحدوں کے اندر ہی کھیلا جاتا ہے۔موت کی ریاضی بھلے ہی بدل گئی ہو مگر تختۂ سیاہ تو انسان کا مقدر کا مارا جسم ہی تھا۔ایسا نہیں تھا کہ جیسا لوگ کہتے ہیں کہ یہ وقت خراب تھا۔ وقت کبھی اچھا نہیں ہوتا کیونکہ جانداروں کا جسم وقت میں ہی موجود رہتا ہے۔وقت سے ماورا ہو کر جسم اپنے آپ کو دُکھ سے آزاد کرسکتا ہے۔مگر ہم سب ابھی وقت میں ہی جی رہے ہیں۔ وقت سے باہر نہیں۔

خبریں ساری دنیا میں پھیلنے لگیں۔ اقوامِ متحدہ اور عالمی ادارۂ صحت نے بھی اِس معاملے میں دلچسپی لینا شروع کر دی اور پھر وہی ہوا جس کی افواہ پہلے ہی سے گشت کر رہی تھی۔یعنی احتیاطی تدابیر اپناتے ہوئے آخر کار حکومت نے چالیس کلومیٹر کے رقبے میں پھیلے ہوئے اس علاقے کو پوری طرح سِیل کر دیا۔اب نہ کوئی یہاں سے جاسکتا تھااور نہ کوئی یہاں آسکتا تھا۔ دیکھا جائے تو تمام شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی۔لوگوں کو اپنے اپنے گھروں میں علیحدگی کے ساتھ رہنے کا حکم دے دیا گیا۔موبائل نیٹ ورک بھی منقطع کر دیا گیا۔اس سے یہ امر بھی آشکار ہوتا ہے کہ محض بیماری بھی انسانوں کو ایک دوسرے سے الگ کرسکتی

ہے۔ایک بخار، کھانسی کا ایک ٹھسکہ، حلق سے باہر آتی ہوئی ایک اُلٹی اور فالج کا ایک حملہ ہمارے اور بیمار کے درمیان ایک دیوار کھڑی کرسکتا ہے۔ اس دیوار کو توڑنا آسان کام نہیں۔ تیمارداری کی اخلاقیات بھی اس پردے کی دیوار کا احترام کرتی ہے۔ اکثر حالات کے مطابق ضرورتوں کو ڈھالا جاتا ہے۔مگر جب ضرورت زیادہ بڑی ہو، زندہ رہنے کی ضرورت تو پھر اُس کے مطابق صورتِ حال کی ایجاد کر لی جاتی ہے۔

لائف اپارٹمنٹ، رفیق انکلیو، جنت باغ، فلورا گارڈنز اور دوسری سوسائٹیز کے گرد پولیس کا محاصرہ کر دیا گیا۔ بحالت مجبوری وہاں اپنا ڈیرہ جمائے بیٹھی ہوئیں منرل واٹر اور کولڈ ڈرنک کی کمپنیوں کی ایجنسیاں بھی اپنی دوکانیں بڑھا گئیں۔ حفاظت کے خیال کو مدّنظر رکھتے ہوئے جل بورڈ کے پانی کے ٹینکر بھی یہاں سے ہٹا لیے گئے۔اب جو بھی تھا، جہاں بھی تھا، وہیں محصور ہو کر رہ گیا۔ بیماری اب ایک جرم تھی، ایک سماجی انحراف۔جس گھر میں کوئی موت واقع ہوتی اُس گھر کے دروازے پر کراس کا نشان لگا دیا جاتا اور پولیس والے اُس میں رہنے والے دوسرے افراد کو اپنے ساتھ کار میں بٹھا کر کہیں دور لے جاتے، شاید زندہ انسانوں کا بھی کوئی قبرستان تھا۔ اُسی اندھیرے میں اُنھیں دفن کرنے وہ اُنھیں بھی لے جاتے جو بیمار نہ تھے۔

یہ تو اچھا تھا کہ اِس شہر میں کوئی ہوائی اڈّہ نہیں تھا، ہاں مگر ایک فوجی ہوائی اڈّہ ضرور تھا مگر احتیاطی تدابیر کے طور پر فی الحال اُس کی اُڑانیں بھی روک دی گئی تھیں کیونکہ یہ علاقہ ایئرفورس کالونی کے نزدیک تھا اور ملٹری چھاؤنی بھی یہاں سے تقریباً ملی ہوئی تھی۔ چاند ماری کے میدان میں ہونے والی فائیرنگ کی آوازیں لائف اپارٹمنٹس میں رہنے والے اکثر سنتے رہتے تھے۔شہر کے اس حصے کو دوسرے حصّے سے منسلک کرنے کا کام، کالی ندی پر بنا ہوا ایک پرانا کنگورے دار سفید پُل کرتا تھا۔ اِسی پُل کے دونوں سروں پر پولیس کا پہرہ بٹھا دیا گیا۔ پُل کے مغرب میں ایئرفورس کی پرانی کالونی تھی اور مشرق میں ملیٹری کے

ممنوعہ علاقے میں چاند ماری کا میدان تھا اور اُن دونوں کے درمیان سے کالی ندی بہا کرتی تھی۔ وہ چھوٹی اور پتلی سی ندی جو شمالی پہاڑوں میں واقع کسی جھرنے سے نکل کر آتی تھی اور اِس بات کے لیے بدنام تھی کہ نہ جانے کہاں کہاں سے 'لاوارث لاشیں' اس میں بہہ بہہ کر آتی ہیں۔ دراصل کالی ندی کا راستہ بہت گھنے اور خطرناک جنگلوں میں سے ہو کر گزرتا تھا۔

پُل کے اِدھر اور اُدھر دونوں طرف ناکہ بندی تھی۔ دونوں طرف لوگ اپنے اپنے گھروں میں قید تھے، مگر پھر بھی ان دونوں علاقوں میں ایک بڑا اور واضح فرق تھا اور وہ یہ کہ اُدھر پانی کی سپلائی ہو رہی تھی مگر اِدھر نل سوکھے پڑے تھے۔ پانی کا نام ونشان تک نہ تھا۔

مگر دنیا قائم تھی اگرچہ اب اس دنیا کو بھوگنا، گندے پانی میں پیدا ہونے والی مچھلیوں کو بھون بھون کر کھانے کے برابر ہے۔ سنا ہے کہ گندے اور میلے پانی سے پیدا کی گئی مچھلیاں لذیذ ہوتی ہیں۔

SB\1.jpg not found.

Jesus Christ, You
travelled through towns
and villages curing
every disease and illness"
Come to our aid now, that we may
experience your healing love.

لائف اپارٹمنٹس کے فلیٹ نمبر 13 میں، جو سب سے اوپری منزل پر واقع ہے، ایک ادھیڑ عمر کا شادی شدہ جوڑا، ساکت و جامد بیٹھا ہوا ایک دوسرے کو خالی خالی آنکھوں سے دیکھے جا رہا ہے۔ برابر والے کمرے میں سے ایک لڑکے کی کھانسی کی آواز لگاتار چلی آ رہی ہے۔ نہیں، نہیں۔ یہاں وائرس سے بیمار کوئی نہیں ہے۔ مگر اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ بیماری کے قیمتی خزانے پر صرف اسی منحوس وائرس کا اجارہ تو نہیں۔ دنیا میں ہزاروں طرح کے جراثیم ہیں اور ایسا کوئی اُصول نہیں کہ جس زمانے میں یہ وائرس چھٹے بیل کی طرح ہر جگہ گھومتا اور منھ مارتا پھر رہا ہو، دوسری بیماریاں یا دوسرے جراثیم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے۔

لڑکے کو پھیپھڑوں کی پرانی ٹی۔بی۔ ہے اور لاپرواہی کی وجہ سے اس کا علاج بیچ بیچ میں ٹوٹتا رہتا ہے۔ بیماری بگڑ چکی ہے۔ دن میں کم از کم چار پانچ بار کھانسی کے خشک دوروں کے ساتھ اُس کے منھ سے خون آنے لگتا ہے۔ بخار تو زیادہ نہیں رہتا مگر یہ تو سامنے کی بات ہے کہ ہلکا بخار رہنا زیادہ خطرناک اور کیف پُر اسرار ہوتا ہے۔ وہ کھال اور گوشت کے نیچے ہڈیوں میں کسی سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا ہے۔ جہاں سے اُسے آسانی سے باہر نہیں نکالا جا سکتا۔

اُس کی قمیص پر خون لگا ہوا ہے۔ عورت نے کہا، میں نے بھی دیکھا ہے۔ قمیص بدلی نہیں۔ مرد نے کہا، تین قمیصیں اور تین پاجامے خون کے دھبّوں سے پٹے پڑے ہیں۔ دھوؤں کیسے؟ اب تو بازار میں بھی پانی نہیں مل رہا ہے۔ پینے کے پانی کا بس یہ ایک جگ بچا رہ گیا ہے۔ میں نے جانے کیسے کیسے کر کے اکٹھا کیا ہے۔ مرد اُٹھ کر سامنے لکڑی کے اسٹول پر رکھے ہوئے جگ کے اندر جھانکنے لگتا ہے۔ جھانک کیا رہے ہو، پانی ہے۔ عورت کا لہجہ ناگوار ہے۔ مرد خاموشی سے واپس آ کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ ذرا دیکھو، وہ بہت زور سے کھانس رہا ہے۔ مرد کہتا ہے، تم ہی دیکھ لو۔ پیدا تو تم نے بھی کیا ہے۔ عورت کا لہجہ ابھی بھی ناگوار ہے۔ جا رہا ہوں۔ مرد تھکی ہوئی آواز میں کہتا ہے اور لڑکے کے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ عورت بھی کچھ منھ ہی منھ میں بڑبڑاتی ہوئی اُس کے پیچھے آ رہی ہے۔ تقریباً گیارہ سال کا لڑکا ہے۔ اُس کا چہرہ کھانستے کھانستے سرخ ہو گیا ہے۔ اُس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ رکھی ہیں۔ اُس کا سر تکیے میں اس طرح دھنسا ہوا ہے۔ جیسے دلدل میں پھنس گیا ہو۔ اُس کی پتلی پتلی ٹانگیں کانپ رہی ہیں اور پسلیاں چل رہی ہیں۔ عورت اور مرد دونوں زور زور سے اُس کی پیٹھ سہلانے لگتے ہیں۔ نہیں کوئی بات نہیں، بیٹا۔ پھندہ لگ رہا ہے اور کوئی بات نہیں۔ دونوں مل کر کہتے ہیں اور اُن کے جملے شور میں بدل جاتے ہیں۔ پانی۔ پانی۔ لڑکا پھولتی ہوئی سانسوں کے درمیان آہستہ سے بدبداتا ہے۔ اُس کی آواز اُس چوہے سے مشابہہ ہے جو اچانک چوہے دان میں پھنس گیا ہو۔ عورت پانی کے آخری جگ میں سے ایک چھوٹی سی تانبے کی کٹوری میں پانی اُنڈیلتی ہے۔ پانی نہیں، پانی کی چند بوندیں ہیں۔ پانی کی چند بوندیں لڑکے کے حلق میں ڈال دی جاتی ہیں۔ اور — اور پانی — اور پانی۔ لڑکا کپکپاتی ہوئی آواز میں کہتا ہے۔ مگر ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے جب پانی کی کچھ اور بوندیں اُس کے منھ میں اُنڈیلی جائیں گی۔ جیسے جیسے اُس کی کھانسی کم ہو رہی ہے ویسے ویسے اُس کے سرخ چہرے پر زردی واپس رینگتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ جلد ہی اس زردی نے

لڑکے کے چہرے کو اس طرح ڈھک لیا جیسے مغرب میں ڈوبتے ہوئے لال سورج کو آسمان پر چھاتا ہوا زرد غبار ڈھک لیتا ہے۔

اُس کی قمیص اُتار دیں۔ مرد نے آہستہ سے کہا۔ آج نہیں کل۔ شاید کل پانی آجائے۔ عورت نے کمزور لہجے میں جواب دیا۔ پانی کا کیا بھروسہ۔ مرد نے ٹھنڈی سانس لی۔ اور یہ سچ تھا کہ بہنے والی چیزوں کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ وقت کی طرح ہوتی ہیں۔

مرد کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں وقت مل رہے ہیں۔ شام ہو رہی ہے۔ کچھ دیر پہلے تک مشرق میں اُڑنے والی چیلیں اب تقریباً ڈوب گئے سورج کی چھوڑی ہوئی لالی کے آس پاس، مغرب میں منڈلانے لگی ہیں۔ اچانک لڑکا دوبارہ کھانستا ہے۔ پہلے آہستہ سے کھانسی کا ایک ٹھسکہ آتا ہے، پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ وہ اُٹھ کر باتھ روم سے ملحق دیوار پر لگے ہوئے واش بیسن کی جانب بھاگتا ہے۔ اُس کا منھ اُبکائی کے لیے کھلتا ہے۔ منھ سے گاڑھا گاڑھا خون نکل کر سفید چینی کے بیسن میں گرنے لگتا ہے۔ بیسن پہلے سے ہی خون سے بھرا پڑا ہے۔ وہاں پانی کا قطرہ تک نہیں۔ وہ لرزتے ہوئے ہاتھ سے ٹونٹی کھولتا ہے تو اُس میں سے صرف سرسراتی ہوئی ہوا باہر نکلتی ہے، ایک بھوتا نہ ہوا۔

عورت شاید جاہل اور گنوار ہے۔ وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے بے تحاشہ پیٹنے لگتی ہے۔ وہ غم اور غصّے سے پاگل ہو رہی ہے۔ وہ ایک ڈائن میں بدل گئی ہے جو اپنے بچے کو کھا جاتی ہے۔ مر جا۔ اِس سے تو تُو مر جا۔ کل کا مرتا ہوا آج مر جا۔ جینا حرام کر دیا۔ مرتا بھی نہیں۔ ہائے میں کیا کروں۔ وہ بے تحاشہ منھ بھر بھر کے لڑکے کو کوس رہی ہے اور اپنے سینے پر دوہتھڑ مارے جا رہی ہے۔ جس کے سبب اُس کے بھاری بھاری پستان اِس طرح ہل رہے ہیں جیسے زلزلے کی زد میں آ گئے ہوں۔

کیوں کوس رہی ہو بچے کو۔ دونوں وقت ملے بھلا کسی کو کوسا جاتا ہے۔ مرد تنبیہ کرتا ہے۔ یہ آمین کی گھڑی ہوتی ہے۔ مرد تنبیہ کرتا ہے۔ تو کیا کروں مار ڈالو مجھے۔ واش بیسن میں

ابھی تک وہی پرانا خون جمع ہے جو یہ تین دن سے اُگل رہا ہے، اوک رہا ہے خون کیسے بہاؤں۔ پانی کو موت آ گئی ہے۔ خون بھرے کپڑے کیسے دھوؤں۔ پانی کو موت آ گئی ہے، اسے کیوں نہیں آتی۔ یہ کیوں نہیں مر جاتا۔ عورت زور زور سے چیختی ہوئی فرش پر اُکڑوں بیٹھ جاتی ہے۔ مجھے قے آ رہی ہے۔ وہ کہتی ہے اور سوکھی سوکھی اُبکائیاں لینے لگتی ہے۔ جو کراہیت اور صدمے سے متاثر ہونے کے سبب آیا کرتی ہیں۔

لڑکا کپکپاتا ہوا اپنی ماں کے قریب آ گیا ہے۔ اُس کے ہونٹوں اور ٹھوڑی پہ خون چپکا ہوا ہے۔ وہ اب کھانس نہیں رہا ہے۔ اُس نے کھانسی کو کسی نامعلوم طاقت کے ذریعے روک لیا ہے۔ امّی، امّی۔ وہ ماں کا کندھا پکڑتا ہے۔ امّی ناراض مت ہو۔ اب نہیں کروں گا خون کی اُلٹی۔ کبھی نہیں کروں گا۔ میری اچھی امی۔ لڑکے کو اِس وقت ہلکا بخار نہیں بلکہ تیز بخار ہے۔ سارا بدن تپ رہا ہے اور چہرہ نہ تو لال ہے نہ پیلا۔ چہرہ کالا پڑ گیا ہے۔ اُس کی قمیص سے پسینے اور خون کی بھاپ اُٹھ رہی ہے۔ عورت فرش سے اُٹھتی ہے اور زور زور سے روتے ہوئے لڑکے کو چمٹا لیتی ہے۔ عورت کی گردن پر، لڑکے کے منھ اور ہونٹوں پر چپکا ہوا خون خاموشی کے ساتھ آ کر لگ گیا ہے۔ ماں بیٹے ایک دوسرے سے لپٹ کر رونے لگے ہیں۔ مگر رونے کی یہ آوازیں غیر انسانی ہیں۔ انسان اِن آوازوں میں نہیں روتے۔

مرد کو اچانک سخت گرمی میں بھی سردی لگنے لگتی ہے۔ اُس کے دانت بجنے لگتے ہیں۔ دانت بجنے کی وجہ سے وہ اُن کے رونے کی آوازیں نہیں سن سکا ہے۔ وہ یہی سوچے جا رہا ہے کہ کاش اُس کی آنکھوں کا آپریشن کامیاب نہ ہوتا، وہ پہلے کی طرح اندھا ہی رہتا۔ آخر اندھا پن ایک نعمت بھی تو ہے۔

اب اندھیرا ہو گیا ہے، جلد ہی سوسائٹی کی سڑکوں اور پارکوں میں لگے ہوئے بجلی کے کھمبے روشن ہو جائیں گے مگر کسی کو یہ نہیں معلوم کہ پانی کب آئے گا۔

کسی کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ جلد ہی یہ بیماری انسانوں کے ساتھ ساتھ کتوں کو بھی اپنی

گرفت میں لے لے گی۔ کتّے پہلی بار ہر جگہ مٹّی کریدتے ہوئے نظر آئے۔ پھر گندگی کرتے ہوئے اور پھر اُلٹیاں کرتے ہوئے۔ اُن کے منھ سے ہرے ہرے جھاگ نکلنا شروع ہوگئے۔ کھڑکی اور بالکونیوں میں کھڑے ہوئے لوگوں نے اُنھیں دیکھا۔ پہرہ دیتے ہوئے پولیس والوں نے اُنھیں دیکھا۔ کتّے پالتو نہ تھے، مگر کالونی والوں کے لیے اجنبی بھی نہ تھے۔ وہ یہیں گھومتے رہتے تھے اور ہر آتے جاتے کو دیکھ کر محبت سے اپنی دُمیں ہلاتے تھے۔ مگر اَب منھ میں جھاگ بھرے ہوئے یہ کتّے حواس باختہ سے اِدھر اُدھر دوڑتے تھے۔ پھر کسی نامعلوم تکلیف کے سبب زمین پر لوٹیں لگانے لگتے تھے۔ اُن کی آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح سرخ تھیں اور اُن کے جبڑے پھیل گئے تھے۔ اور کوئی شخص تو گھر سے باہر نکل نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ باہر نکلنے کی سزا جیل تھی۔ مگر کالونیوں میں پہرہ دینے والے پولیس کے سپاہی تو باہر موجود تھے جو سرکار کی طرف سے ڈیوٹی کے لیے دی گئی اپنی اپنی پانی کی بوتلوں کو ایک دوسرے سے چھپا کر رکھتے تھے اور یہ احتیاط بھی کرتے تھے کہ کبھی کھڑکی یا بالکونی میں کھڑے شخص کی نظر ان بوتلوں پر نہ پڑ جائے۔

کتّے ان پولیس والوں کو بھنبھوڑنے لگے۔ وہ عجیب وغریب طرح سے پاگل ہوگئے تھے۔ وہ اگر کسی پنڈلی منھ میں دبا لیتے تو چھوڑتے ہی نہیں تھے اور طرح طرح کی غرّاہٹیں اپنے حلق سے نکالتے رہتے جن میں شدید غصّے کے علاوہ ایک ناقابلِ فہم قسم کی تکلیف بھی شامل تھی۔ اُن کے سر اور جسم کو ڈنڈوں سے بے تحاشہ مارا جاتا تب کہیں جاکر وہ اُس چبائی گئی پنڈلی کو چھوڑتے مگر جیسے ہی وہ یعنی کتّے ہٹتے، اُن کے کاٹے کا شکار وہ بدنصیب پولیس والا فوراً ہی کتوں کی ہو بہو آواز میں بھونکنے لگتا۔ چاروں ہاتھ پیروں پر چلتا ہوا، وہ دوسرے آدمیوں کو کتّے کی طرح ہی کاٹنے کے لیے دوڑتا۔ اُس کی آنکھیں لوہار کی بھٹّی کی طرح سرخ ہوتیں اور جبڑے پھیل جاتے۔ جلد ہی ان اطراف میں نظر آنے والے ہر کتّے کو دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم صادر کر دیا گیا اور شاید اُس شخص کو بھی جسے کتّے نے کاٹا ہو۔

اگرچہ یہ یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا۔

مگر کیا اس دنیا کے بارے میں یقینی طور پر کچھ بھی کہا جاسکتا ہے — کیا دنیا اپنی مرضی سے اب ختم ہونے والی تھی۔ اگر ایسا تھا تو زمین اور فطرت کو اپنے کام کرنے سے روکنے کا حق کس کو تھا۔ اگر فطرت اور زمین نے اپنے آگے کے منصوبے بغیر انسان کی شمولیت کے بنا ہی لیے تھے اور اَب وہ اپنا کام جانداروں کی مطلق غیر حاضری میں اکیلے ہی کرنا چاہتی تھیں تو ہمیں اس فیصلے کا احترام کرتے ہوئے دنیا کو ایک اچھے کرایہ دار کی طرح خوش دلی کے ساتھ خالی کر دینا چاہیے۔

گلاب اپارٹمنٹس کے ہر فلیٹ میں ایک ہی قسم کی مصیبت آئی ہوتی ہے۔ سب کو ایک ہی شکایت ہے اور سب کا ایک ہی مسئلہ ہے۔ ویسے یہ مسئلہ اِن اطراف کی تمام سوسائٹیز میں مشترک ہے لیکن کسی بھی تاریخی بیانیہ کی تائید کے لیے بس ایک دو مثالیں ہی کافی ہوتی ہیں۔ ورنہ گلاب اپارٹمنٹس کے لفظ کو مون انکلیو، آفتاب باغ اور فلورا گارڈن سٹی بھی پڑھا اور لکھا جاسکتا ہے، کوئی فرق نہیں پڑتا۔

گلاب اپارٹمنٹس کے فلیٹ نمبر 13 میں ہر طرف بدبو پھیلی ہوئی ہے۔ بلکہ کہنا چاہیے بدبوئیں پھیلی ہوتی ہیں۔ گھر میں ہوا کے دباؤ کے تحت کبھی ایک بدبو حاوی ہوجاتی ہے اور کبھی دوسری اور کبھی تیسری۔ یہ بدبوؤں کا ایک نہ نظر آنے والا اسمبلاژ ہے جس کے مختلف رنگوں کو صرف ناک کی آنکھیں ہی دیکھ سکتی ہیں۔ اِن دنوں ناک پر نت نئے انکشافات ہو رہے ہیں اور قوتِ شامہ نئے نئے جہانوں کی سیر کو نکل کھڑی ہوئی ہے۔ دروازے اور کھڑکیوں کے شیشے بند ہونے کے باوجود نہ جانے کہاں سے آکر ڈھیر ساری ہرے پروں والی مکھیاں بھنبھنانے لگی ہیں۔ یہاں کے ہر فلیٹ میں دونوں اقسام کے ٹوائلٹ بنوائے گئے ہیں۔ ایک مغربی قسم کے کموڈ والا اور دوسرا مشرقی روایت کی پاسداری کرتا ہوا۔ دونوں قسم کے کموڈ انسانی فضلے سے لبالب بھرے ہوئے ہیں۔ دونوں سیٹوں کی سفید چینی اس گندگی میں ڈھک

کر رہ گئی ہے۔فلش کرنے کی ٹنکی نہ جانے کب سے سوکھی پڑی ہے۔اُس پر موٹے موٹے چیونٹے رینگتے پھر رہے ہیں۔ ہر بالٹی خالی ہے اور ہر برتن خشک اور گندا باورچی خانے میں نہ جانے کب سے جھوٹے برتن پڑے سڑ رہے ہیں۔ باورچی خانے سے وہی بدبو اُٹھ رہی ہے جو پاخانے سے آ رہی ہے۔ زیرزمین نالیاں بھی بند ہیں اور اُن میں گندگی ٹھسی ہوئی ہے۔سارے گھر میں سوکھے ہوئے پیشاب کی ایسی کھراند ہے کہ گمان گزرتا ہے کہ یہ کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہر طرف ڈھیر سی بکریاں بندھی ہوئی ہیں۔ واش بیسن میں نہ جانے کب کی، کی گئی کلّیوں کے ساتھ منھ سے نکلے ہوئے غذائی ذرّات، تھوک اور بلغم اکٹھا ہیں۔ یہ جہنم ہے۔ جیتا جاگتا جہنم جس کی آگ کو اور بھڑکانے کے لیے وہاں تین بچے اور اُن کے ماں باپ بھی زندہ موجود ہیں۔ باپ جس کی آنکھیں بھوری مگر بے نور ہیں اور اُس کی ٹانگ میں پلاسٹر بندھا ہے۔ ایک زنگ آلودہ وہیل چیئر پر بیٹھا ہے۔ اس کی پلاسٹر سے بندھی ہوئی ٹانگ کے نیچے ایڑی میں ایک زخم ہے جس پر بار بار ایک مکھی آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ باپ، بچوں کی ماں، جس کی آنکھیں اور بھی زیادہ بھوری ہیں، جس کی چپٹی ناک ہے اور جو خونی بواسیر کے موذی مرض میں مبتلا ہے اور جو بیت الخلا کے نام سے خوف کھاتی ہے، کو غصّے سے دیکھے جا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے مجھے کھا جاؤ گے۔ آنکھیں نہیں ہیں تو یہ حال ہے۔ آنکھیں ہوتیں تو پتہ نہیں اُس میں کتنی نفرت ہوتی۔ عورت کہتی ہے۔ آنکھیں ہوتیں تو دیکھتا کہ تمھارے تھوبڑے پر میرے لیے کتنی نفرت ہے۔ مرد جواب دیتا ہے۔ بچّے بے وجہ شور مچا رہے ہیں۔ پھر ایک بچّہ بھاگا بھاگا آتا ہے اور کہتا ہے۔ امّاں، امّاں! ہم کیا کریں۔ پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ میرے سر پر کر دو کم بختو! تمھارا ناس جائے۔ بھری دوپہر میں یہ کوئی وقت ہے۔ ماں دہاڑتی ہے۔ اماں بڑے زور کا لگ رہا ہے۔ چار سالہ بچہ اپنا پیٹ پکڑے ہوئے باپ کے پاس آ کر بولا۔ ابّا جاؤں کہاں جاؤں۔ ورنہ نکل جائے گا۔ اُس کے پیچھے پیچھے تقریباً آٹھ سال کا دوسرا بچہ بھی اپنا نیکر سنبھالتے ہوئے چلا آیا ہے اور کہہ رہا ہے کہ

پہلے وہ فارغ ہوگا۔نہیں، پہلے میں۔نہیں، میں— میں۔

یہ یقیناً مضحکہ خیز بلکہ کسی گھٹیا قسم کے مزاحیہ ڈرامے کا کوئی منظر معلوم ہوتا ہے۔مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مضحکہ خیزی اور لطیفوں میں ایک ایسی دہشت چھپی رہتی ہے جس کو اگر محسوس کر لیا جائے تو ہماری ہڈیاں بجنے لگیں۔ ویسے یہ دنیا بھی محض ایک لطیفہ ہے جسے دوسرے سیاروں کی تفریح کی غرض سے بنایا گیا ہے۔

جاؤ، سیٹ پر مت بیٹھنا۔فرش پر ہی کر لو۔سوکھ جائے گا۔ باپ نے لاپرواہی سے مشورہ دیا۔ اچھا، خوب مشورہ دے رہے ہو، گندگی پھیلانے کا۔تم اندھے ہو، تمھیں گندگی نظر نہیں آتی۔مگر کیا تمھاری ناک بھی مٹ چکی۔تمھیں کوئی بدبو خوشبو کچھ نہیں آتی۔خود بھی ہر وقت جانوروں کی طرح چرتے رہتے ہو اور بچوں کو بھی چراتے رہتے ہو۔ جب دیکھو ٹوائلٹ میں گھسے ہوئے ہیں۔معلوم ہے کہ مرنے کے لیے بھی پانی نہیں ہے۔عورت کہتے کہتے ایک لمحے کو رُکی، پھر دوبارہ کہنا شروع کر دیا۔ بلڈ پریشر کی دوا یونہی چبالیا کرتی ہوں۔ نگلنے کو پانی نہیں۔اپنی حاجت روک لیتی ہوں کہ ٹوائلٹ میں نہ جانا پڑے۔قبض کرنے والی دوائیں لگاتار نگل رہی ہوں چاہے میری آنتیں سڑ جائیں مگر میں اُس منحوس اور غلاظت سے بھری ہوئی جگہ پر جا کر ہرگز نہ بیٹھوں گی۔ بولتے بولتے اُس کا گلا بیٹھنے لگا۔ جب میں نے اُس وقت کہا تھا کہ نکل جاتو مایا کے ناگ کی طرح جم کر بیٹھ گئی تھی۔ کچھ بھی ہو جائے، گھر نہیں چھوڑوں گی۔ مرد نے ڈانٹ کر کہا۔ ہاں میں تو نہیں لے جاتی تمھیں اپنے مائیکے اور تو تمھارا کوئی ہے نہیں۔ سسرال کی روٹیاں توڑنے کا شوق ہے۔ ویسے کیا مجھے معلوم نہیں ہے کہ تم میری چھوٹی بہن پر نظر رکھتے ہو۔ اپنے اندھے پن کا فائدہ اُٹھاتے ہو اور اُس کے سینے کو اپنے ہاتھوں سے چھونے کی کوشش کرتے رہتے ہو۔عورت نے زہر آلود لہجے میں کہا۔تُو بکواس بند کرے گی یا نہیں۔ مرد نے کچھ اس انداز میں کہا کہ وہ لمحے بھر کو خاموش ہوئی۔ پھر کچھ اس طرح بڑبڑانا شروع کر دیا جسے صرف وہی سن سکتی تھی۔تقریباً گیارہ سال

کی ایک بچی دوسرے کمرے سے نکل کر آتی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں وہ آنسو بھرے ہوئے ہیں جو گھبراہٹ کے موقع پر نکل کر آتے ہیں۔ اماں، اماں۔ اِدھر آؤ، بات سنو۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں کہتی ہے۔ کیا ہوا کم بخت۔ میرے پاس پانی نہیں ہے۔ تجھے ہر گھڑی پیاس لگی رہتی ہے۔ بڑی گرمی بھر گئی ہے تیرے اندر۔ عورت چلاّئی۔ نہیں اماں! پانی نہیں چاہیے، تم اِدھر آ کر میری بات سن لو۔ بچی حواس باختہ ہے۔ عورت کراہتے ہوئے بچی کے پاس جاتی ہے۔ وہ دونوں دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔

بچی ماں کو اپنی شلوار کی طرف دیکھنے کا اشارہ کرتی ہے جس پر خون کے دھبّے ہیں۔ میرے پیڑو میں بہت درد ہو رہا ہے۔ وہ رو کر کہتی ہے۔ مرجا حرّافہ۔ ابھی ہی جوان ہونے کو رہ گئی تھی۔ دیکھتی نہیں کہ گھر میں پانی نہیں ہے اور تو مہینہ شروع کر کے بیٹھ گئی۔ عورت بچی کی پیٹھ پر زور زور سے گھونسے مارتی ہوئی چیخنے لگتی ہے۔ بچی روتی جاتی ہے۔ ماں مارتی جاتی ہے۔ مرد زور سے دہاڑتا ہے۔ عورت بچی کو گھسیٹتے ہوئے کپڑوں کی الماری کے پاس لے جاتی ہے اور کہتی جاتی ہے کہ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ خدا موت دے دے۔ مگر خدا ابھی موت نہیں دینا چاہتا۔ ابھی وہ انھیں اور جینے دینا چاہتا ہے۔

حالانکہ کوئی بھی شعوری طور پر جی نہیں سکتا۔ شعوری طور پر مر تو سکتا ہے۔ خودکشی کر سکتا ہے۔ مگر کوئی یہ نہیں کر سکتا کہ سمجھ سمجھ کر زندگی گزارے۔ یہ بالکل اُسی طرح ہے جیسے ٹائپ رائیٹر پر لکھے ہوئے حروف کو غور سے دیکھ کر ٹھہر ٹھہر کر یہ فیصلہ کرتے ہوئے کہ 'پ' کہاں ہے اور 'ژ' کہاں، ٹائپ کیا جائے۔ انگلی تو ایک حرف سے دوسرے حرف تک اُڑتی ہوئی پہنچتی ہے۔ انگلی کی اپنی اُڑان ہے اور اپنا دل ہے، اپنا دماغ ہے۔

یہ سب ایک خواب کی طرح ہے۔ ایک ایسا خواب جسے مرنے کے بعد ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ اِس عورت کا قد مشکل سے چار فٹ رہا ہوگا۔ اُس کا وزن اتنا زیادہ ہے کہ اُس سے دب کر گویا وہ زمین میں دھنسی جاتی ہے۔ وہ ایک ایسی فٹ بال نظر آتی ہے جو آدھی ریت

میں دبی ہوتی ہے۔ بے رحمی کی حد تک پیچھے کو نکلے ہوئے اُس کے کولہوں اور پھولے پھولے مہاسوں سے بھرے گالوں میں ایک ناقابلِ یقین مشابہت ہے۔

اندھے مرد کے چہرے پر پرانی چیچک کے نشان ہیں۔ وہ بھی کبھی وَبا ہوا کرتی تھی، مگر اَب دنیا سے اس کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ لیکن دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے وہ اپنے کبھی نہ مٹنے والے نشان یہیں چھوڑ گئی ہے۔ انسانوں کے چہرے پر ان کو اندھا کر دینے کے بعد وہ ہمیشہ اِس امر کی یاد دلاتی رہتی ہے کہ وہ تھی، وہ ماضی کے اُن گناہوں کی طرح ہے جو آدمی کا پیچھا کبھی نہیں چھوڑتے۔

اندھا آدمی بار بار پلاسٹر کے اندر ہاتھ ڈال کر ٹانگ کھجانے کی کوشش کرتا ہے۔ پلاسٹر کا رنگ اب سفید نہیں رہا، وہ میلا ہو چکا ہے اور اُس پر جگہ جگہ سالن کے پیلے دھبّے بھی ہیں۔ پلاسٹر کے اندر شاید کھٹمل پیدا ہو گئے ہیں۔ کچھ کھانے کو ہے، وہ کہتا ہے کیونکہ وہ کچھ دیکھتا نہیں۔ کچھ نہیں ہے، ابھی تو کھا کر اُٹھے ہو۔ عورت کھسیا کر جواب دیتی ہے، مگر مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ پانی ہے۔ وہ پھر کہتا ہے۔ بس ایک جگ پانی بچا ہے۔ دوا نگلنے کے لیے پانی نہیں ہے۔ میرے گردے خراب ہو رہے ہیں۔ تمھارے ساتھ رہ کر مجھے یہ ساری منحوس بیماریاں لگ گئی ہیں۔ ورنہ شادی سے پہلے میں کتنی تندرست اور خوبصورت لڑکی تھی۔ اب تو اچھا ہے کہ یا تم مر جاؤ یا میں مر جاؤں۔ عورت زور سے بڑبڑاتی ہے۔ اندھا آدمی زور سے ہنستا ہے۔ اُس کی وہیل چیئر کے پہیے ہلنے لگتے ہیں۔ 'خوبصورت لڑکی' اندھا ہنستے ہوئے کہتا ہے۔ اگر تمھاری آنکھیں ہوتیں تو تم دیکھ پاتے۔ کاش میں نے ترس کھا کے تم سے بیاہ نہ کیا ہوتا۔ عورت کے لہجے میں حقارت تھی۔

ممکن ہے کہ کبھی اُن دونوں میں تھوڑی سی وقتی محبت رہی ہو مگر اِسے کیا کہیں کہ محبت کے پڑوس میں بیزاری رہتی ہے اور خلوص کے برابر والی کھڑکی میں سے کینہ کا چہرہ ہمیشہ سڑک پر چلنے والوں کو گھورتا رہتا ہے۔

اندھا اپنی وہیل چیئر کو دھکیلتا ہوا کھانے کی میز کی طرف جا رہا ہے۔ اُس نے میز پر رکھی ہوئی ڈبل روٹی کے دو ٹھنڈے سلائس نکال لیے ہیں۔ تو نے ترس کھا کر مجھ سے شادی کی تھی؟ تیرے باپ نے میری دولت کے لالچ میں آ کر تجھے میرے سر منڈھ دیا تھا۔ میں نے چالیس لاکھ کا یہ فلیٹ اُسی کے کہنے پر تیرے نام کیا تھا۔ میرا بہت بڑا کاروبار تھا۔ میں زردوزی اور کارچوب کے کاریگروں کو سعودی عرب بھجوایا کرتا تھا۔ تیرے دو بھائیوں کے بھی ویزے لگوائے، بھول گئی؟ اندھا کہے جا رہا تھا، مگر تب ہی اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی ایڑی کا زخم رِسنے لگا ہے۔ زخم پر دو مکھیاں آ کر بیٹھ گئیں۔ مکھیوں کو بھگانے کے لیے وہ اپنی ایڑی کو بار بار فرش پر بجانے لگا۔ مگر اِس سے کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ایڑی فرش پر بجانے سے زخم میں سے زیادہ خون نکلنے لگا ہے۔ مکھیاں اب بھلا زخم سے کیوں دور جائیں گی۔

اندھا اندازے سے سلائسوں کو ٹوسٹر کے اندر ڈال رہا ہے۔ اِس ٹوسٹر میں بھی ایک تکنیکی خرابی ہے۔ اس میں سے کبھی تو سیاہ اور کوئلے کی طرح سخت جلا ہوا سلائس باہر نکل آتا ہے اور کبھی بالکل سفید، کچا اور ٹھنڈا۔ بجلی سے چلنے والی چیزوں میں اگر اس قسم کی کوئی پُراسرار خرابی پیدا ہو جائے تو وہ جاتی نہیں ہے۔ وہ گھوڑے میں پیدا ہو جانے والے عیب کی طرح ہوتی ہے۔ یا انسان کے مقدر کی خرابی کی طرح۔

اچھا چل چھوڑ، تھوڑا پانی دے۔ گلا سوکھ رہا ہے۔ اندھے نے جھگڑا ٹالنا چاہا مگر وہ جھگڑا ختم نہیں کرنا چاہتی۔ اُس کے گال پھول کر کُپّا ہو گئے۔ اُس کے بھاری بھاری کولھے ایک نامعمول انتقام لینے کے درپے ہو کر کچھ اور باہر کو نکل آئے۔ گلا سوکھ رہا ہے۔ ہونہہ، زندگی بھر شراب پیتا رہا، اُسی موت سے گلا تر کر۔ وہ غصّے سے آگ بگولا ہو کر زور سے چیخی۔ اپنی زبان بند کر رنڈی۔ بھڑوے تو چُپ رہ۔ تو رنڈی۔ تو بھڑوا۔

بچّے اُن کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے ہیں اور سسکیاں لے کر رو رہے ہیں۔

عورت اندھے مرد کے بہت قریب کھڑی ہوئی غصّے سے کانپ رہی ہے اور اُس کے

منہ سے تھوک کے جھاگ اُڑ رہے ہیں۔ آنکھیں سرخ ہیں اور اپنے حلقوں سے باہر اُبل آئی ہیں۔ اس کے جبڑے پھیل گئے ہیں۔ وہ پاگل کتیا نظر آ رہی ہے۔ دفعتاً اندھا اپنی ٹوٹی ٹانگ سے اُس کے پیٹ پر ایک زبردست لات مارتا ہے۔ عورت تھوڑا سا پیچھے کی طرف پھسلتی ہے۔ پھر سنبھل کر سیدھے کھڑے ہو کر اندھے کے منہ پر نفرت سے تھوک دیتی ہے۔ تھو۔ تھو۔ تھو۔ اندھا دوبارہ اُس کے پیٹ پر لات مارتا ہے۔ عورت میز پر رکھے ہوئے پانی کے جگ کو اُس کے سر پر دے مارتی ہے۔ کچّے شیشے کا بنا ہوا جگ اندھے کی کھوپڑی سے ٹکرا کر چکنا چور ہو جاتا ہے اور پانی سے اُس کا سر اور کندھے بھیگ جاتے ہیں۔ اندھا دونوں ہاتھوں سے اپنا سر ٹٹولتا ہے۔ اس کے ہاتھ پانی اور خون سے سن گئے ہیں۔ وہیل چیئر کے پہیے جھٹکے سے بے قابو ہو کر بائیں طرف کو چلنے لگے ہیں۔ وہ اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں اپنے ہاتھوں کو اِدھر اُدھر پھیلا رہا ہے۔ اِس سے پہلے کہ بچے دوڑ کر اُس کی مدد کریں، غلطی سے پانی اور خون میں تر اُس کا ہاتھ ٹوسٹر پر پڑ گیا ہے۔ اس کے ہاتھ کی تین انگلیاں ٹوسٹر کے اندر گہرائی میں چلی گئی ہیں۔ اندھے کے منہ سے ایک خوفناک مگر صرف آدھی چیخ ہی برآمد ہوتی ہے۔ وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے کچھ لمحوں کے لیے اس کا جسم اوپر نیچے جھٹکے کھاتا ہے، جیسے گندے پانی میں مینڈک اُچھلتا ہے۔ پھر یہ جسم سیاہ ہو کر بے حس و بے جان ہو جاتا ہے۔

جب پولیس کی جیپ عورت کو جیل کے دروازے پر چھوڑنے آئی تو وہاں پہلے سے ہی ایک ایمبولینس کھڑی تھی۔ جس میں ایک قیدی عورت کو پولیس کی نگرانی میں ضلع سرکاری اسپتال لے جایا جا رہا تھا۔ قیدی عورت بھی بیماری کا شکار ہو گئی تھی۔ کھلے آسمان میں دونوں عورتوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اسٹریچر پر لیٹی ہوئی بیمار، قیدی عورت کی ایک آنکھ کو اُس کے ماتھے سے ڈھلک آئے ہوئے بالوں نے ڈھک لیا تھا۔ وہ اپنا ایک ہاتھ بار بار اوپر نیچے کر رہی تھی۔ وہ پھولے پھولے اور مہاسوں سے بھرے ہوئے گالوں اور

بھاری کولہوں والی موٹی عورت کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہے۔ تو تم نے بھی۔ اُس کی مسکراہٹ سوال کرتی ہے۔ ہاں میں نے بھی۔ جیل کے اندر جاتی ہوئی عورت کی مسکراہٹ جواب دیتی ہے۔ پانی کے چکر میں؟ ہاں پانی کے چکر میں۔ ایک عورت جیل سے اسپتال کی طرف جانے والی ایمبولینس میں ڈال دی جاتی ہے۔ دوسری عورت گھر سے جیل کے اندر۔ گھر، جیل، اسپتال اور قبرستان سب ایک ہوگئے ہیں۔ شام ہو رہی ہے۔ درخت سلیٹی مائل ہونے لگے ہیں اور گھاس کالی، دھول اُڑاتی ہوئی ایمبولینس کے سائرن پر دور کہیں کوئی پاگل کتّا بھونکنے لگتا ہے۔

اب کہا جانے لگا ہے کہ مہاماری بہت تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے۔ اگر یہ واقعی مہاماری ہے۔ شہر میں جگہ جگہ ایمبولینسیں گھومتی نظر آ رہی ہیں مگر کچھ دنوں سے لائف اپارٹمنٹس اور اُس کے اطراف میں کسی کالونی سے کسی مریض کے ہونے یا مرنے کی خبر نہیں آئی ہے (وہ ایک ایک دوسری موت مر رہے ہیں) حالانکہ پانی کی سپلائی بند رہنے کی وجہ سے یہاں کچھ ایسے ذہنی مریض ضرور پائے گئے ہیں جنہیں یا تو پاگل خانے بھجوا دیا گیا ہے یا جیل۔ جہاں تک وائرس کا سوال ہے وہ تو پاگل خانے اور جیل دونوں جگہ پہنچ چکا ہے۔ گھروں میں قیدی بنے ہوئے لوگ اپنی عبادت بھی نہیں کر سکتے اور اگر کریں گے تو تمام ارکان پورے نہ ہو سکیں گے کیونکہ طہارت نام کی کوئی شے فی الحال اُن کے پاس نہیں۔ وہ تو اچھا تھا کہ رمضان آکر گزر گئے تھے اور بقرعید ابھی دور تھی ورنہ اُن کے گھر خون میں نہا جاتے اور جانوروں کا گوشت سڑتا رہتا۔ جہاں تک پیاسے مرنے کا سوال تھا وہ تو یہ محرم کے دس دن بھی نہ تھے کہ شہدائے کربلا کی قربانی یاد کرکے، کچھ حوصلہ ملتا اور یہ کرب و بلا کے دن کٹ جاتے۔ مذہبی ارکان پورے نہ کر پانے پر سب ایک دوسرے کو یہ تسلّی دیتے پھر رہے تھے کہ ایسی آزمائش کی سخت گھڑی میں خدا اُنھیں معاف کر دے گا مگر کیا خدا انسانوں کو اُن

کے گناہ اور برے اعمال کے لیے ہمیشہ معاف کرتا رہے گا۔ انسان جو گناہ کرنے سے کبھی دائمی توبہ تک نہیں کرتے تھے۔ خدا کا کام معاف کرنا اور رحم کھانا ہی نہیں، سزا دینا اور عذاب نازل کرنا بھی ہے اور اس بات سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صرف معاف کر دینے والے خدا کو کوئی نہیں مانتا۔

اب ایسا بھی نہیں کہ چور دنیا سے اُٹھ گئے تھے۔ چوروں کی نظر ہمیشہ اُن گھروں پر لگی رہتی تھی جن میں رہنے والے تالہ لگا کر وقتی طور پر کہیں اور رہنے چلے گئے ہوں۔ مگر ایک تو اُنھیں اِن گھروں میں گھسنے پر بیماری لگ جانے کا ڈر تھا اور اگر ایک دو بہادر چوروں نے پولیس کی نظروں سے چھپ چھپا کر، کالونی کے اندر گھسنے کی کوشش کی بھی تو وہاں آوارہ گھومتے ہوئے پاگل کتّوں نے اُنھیں کاٹ کھایا۔ جس کے بعد اُن کے بس میں صرف یہی رہ گیا کہ وہ خود بھی پاگل کتّے کی طرح چار ہاتھ پیروں پر چلتے ہوئے اور بھونکتے ہوئے، تندرست اور شریف آدمیوں کو کاٹتے پھریں۔ ایک چور سے زیادہ اِس کہاوت پر اور کون یقین کرے گا کہ تندرستی ہزار نعمت ہے۔

لائف اپارٹمنٹس کے زندہ مگر پیاسے مکینوں نے اپنے پالتو جانوروں کو مار ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ انھوں نے پنجروں سے نکال نکال کر بے دردی کے ساتھ اپنے طوطوں کی گردنیں مروڑ ڈالی ہیں جو ہر وقت پانی مانگنے کے لیے ٹائیں ٹائیں کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے اپنی پالتو بلّیوں کے گلوں میں رسّی کا پھندا ڈال کر اُنھیں ختم کر دیا ہے جو ہر وقت دودھ کی تلاش میں برتن پھینکتی رہتی تھیں اور میاؤں میاؤں کرتے ہوئے انسانوں کی گود میں گھس جاتی تھیں۔ انسان جانور کو جس طرح دیکھتا ہے، جانور اُس طرح نہیں دیکھ سکتا۔ کتّے اور بلّی کے پاس وہ آنکھیں نہیں ہیں جو کسی شے کو مجموعی طور پر اُس کی مکمل سالمیت میں دیکھ سکیں۔ وہ

انسانوں کو صرف الگ الگ حصوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ جب کتّا کاٹنے کے لیے آدمی کی ٹانگ پکڑتا ہے تو وہ اُس آدمی کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا مگر جب وہ آپ کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے تو اُسے آپ کا باقی جسم نظر نہیں آتا۔ وہ انسانی جسم کی بُو سے ہی اپنی وفاداری کا ثبوت دیتا ہے۔ انسانی جسم کے مکمل ادراک کے ذریعے نہیں۔ یہ آنکھیں تو بس انسان کو ہی بخشی گئی ہیں جو اشیا کو ان کی سالمیت میں ایک ساتھ دیکھنے پر قادر ہیں۔ اس لیے انسان یہ جانتا ہے کہ دوسرا کتنا کمزور، حقیر، احمق اور بے زبان ہے۔ اُسے کتنی آسانی کے ساتھ مسلا جاسکتا ہے، شکار کیا جاسکتا ہے، غلام بنایا جاسکتا ہے اور ذبح کیا جاسکتا ہے۔ اور جب تک کمزور اور بے زبان جانور اس دنیا میں موجود ہیں وہ انسانوں کو اُن کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اپنی جانیں قربان کرتے رہیں گے اور اُن کی مال و دولت کا خراج ادا کرتے رہیں گے۔ مگر یہ سوال پھر بھی رہے گا کہ محض گوشت اور ہڈیوں کی قربانی ہی کافی ہے۔ کیا جانور کا دل اور روح اس میں شامل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے پالتو بے زبان جانوروں کو بغیر رتّی بھر احساسِ جرم کے مار ڈالنے میں حق بجانب تھے۔ اُنھیں اتنے تاریک اور مایوس کن دِنوں میں بھی اِس امر کا خوب احساس تھا کہ وہ تو دراصل اشرف المخلوقات ہیں۔

اب اگر کسی کے گھر سے موت کی خبر آتی ہے تو دوسرے لوگ اپنے اپنے فلیٹوں کی بالکونیوں میں کھڑے ہو کر زور زور سے ہنستے ہیں، تالیاں پیٹتے ہیں، برتن بجاتے ہیں۔ کیونکہ مَوت ہی وہ اصل قانونی دستاویز ہے جو اُنھیں وِرثے میں ملی ہے۔ مَوت ہی انسانوں کی جائز اور حلال جائیداد ہے اور ملک الموت ہی سب سے طاقتور منصف ہے۔ ایسے افراد کے دماغی توازن بگڑ جانے کی کسی کو پرواہ نہیں اور فی الحال اُن کے گھروں پر، اُنہیں پاگل خانے تک لے جانے والی کوئی گاڑی ابھی تک نہیں آئی ہے۔ اُدھر شہر کے کچھ پسماندہ علاقوں سے کچھ ایسی خبریں بھی آرہی ہیں کہ وہاں لوگ بیماری سے بچنے کے لیے بھوت بن کر گھوم رہے ہیں۔ وہ تو ہم پرست اور بدعقیدہ لوگ ہیں۔ حاملہ عورتوں کے بھوت

اور بچوں کے بھوت کا اور لمبے بالوں والے بھوت کا بھیس بدل کر دراصل وہ ایک ایسا کارنیوال منا رہے ہیں جس کی بنیاد دہشت اور خوف ہے اور کسی کو بھی یہ حق نہیں کہ وہ اُنھیں عقلیت پسندی اور سائنسی مزاج اختیار کرنے کا درس دیتا پھرے۔ یہ وہ وقت نہیں جو اس تعلیم کے لیے سازگار ہو۔

گذشتہ تین دنوں میں اِس پُر اسرار اور تقریباً لا علاج بیماری سے مرنے والوں کی تعداد میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا ہے۔ اِس میں پانی کی سپلائی بند ہونے کی وجہ سے خودکشی کرنے والے یا قتل ہو جانے والے افراد بھی شامل ہیں۔ مگر ساتھ ہی ایک خوش آئند اور حیرت انگیز بات بھی سامنے آئی ہے۔ چنگی دفتر کے شعبۂ اموات و پیدائش کے ریکارڈ کیپر نے بیان دیا ہے کہ اتفاق سے انھیں دِنوں سب سے زیادہ بچوں کی پیدائش بھی ہوئی ہے۔ اِس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ اسپتال والوں کی شماریات کا جب موازنہ کر کے دیکھا گیا تو ترسیم کے مطابق کسی ایک مَوت کے وقت کم سے کم چار نوزائیدہ بچوں کا تناسب نظر آیا۔ یہ ابھی ایک اطمینان بخش صورتِ حال کہی جاسکتی ہے کہ فی الحال کسی بھی حاملہ عورت کے اس بیماری کے سبب موت واقع ہونے کی خبر نہیں مل سکی ہے۔ اگرچہ تو ہم پرست اور ضعیف الاعتقاد حضرات اس مخصوص وقفے کو آسیبی اور شیطانی وقت کا ٹکڑا بتا رہے ہیں جس میں لگاتار اَموات کے ساتھ ساتھ بچوں کی بھی زیادہ سے زیادہ پیدائش ہوتی رہے۔ وہ اِس وقفے کے دوران پیدا شدہ بچوں کو اِس وبا کی شیطانی اولاد سمجھتے ہیں اور اُن کے ماں باپ کو بچوں سے دور رہنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ یہ پیش گوئی بھی کر رہے ہیں کہ ایسے تمام بچّے آہستہ آہستہ بہت کمزور اور دُبلے پتلے ہوتے جائیں گے۔ اُن کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑتا جائے گا اور آدھی رات میں اُن کے رونے کی آوازیں جنگلی لومڑیوں سے مشابہ ہوں گی۔ مگر چنگی کے دفتر کے اس ریکارڈ کیپر کو نہ تو یہ سب معلوم ہے اور نہ ہی اُس کا اِن بچوں سے کوئی واسطہ ہے۔ اُس نے تو بس اتنا کیا ہے کہ اَموات اور پیدائش، دونوں کے

ریکارڈ اور سرٹیفیکیٹ دو الگ الگ الماریوں میں بند کر کے تالہ لگا دیا ہے۔

یا تو گرمی بڑھ جانے کے باعث یا کسی اور سبب سے لائف اپارٹمنٹس میں بڑی تعداد میں چھپکلیاں نکلنا شروع ہوگئی ہیں۔ وہ دیواروں اور فرش پر رینگتی پھرتی ہیں مگر بے حد ڈری ڈری اور سہمی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اُن کی بٹن جیسی ننھی ننھی ساکت آنکھیں انسانوں سے کچھ مانگتی ہوئی سی نظر آتی ہیں۔ کبھی کبھی تو گرگٹ کی طرح اپنی دُم پر کھڑی ہو کر انسانوں سے اپنے اِرتقا کے سفر میں پیچھے رہ جانے کا ہرجانہ طلب کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں مگر انسان اُن کی پرواہ نہیں کرتا۔ اُسے اپنے ہی گناہوں کا اِزالہ کرنے سے فی الحال کوئی فرصت نصیب نہیں۔

آدھی رات کے بعد کھڑکیوں کے شیشوں پر چمگادڑ آ آ کر ٹکراتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں۔ اِن اطراف میں چمگادڑ کبھی نہیں پائے گئے ہیں مگر اب غول بنا کر نہ جانے کہاں سے چلے آتے ہیں۔ چمگادڑ دنیا کی سب سے خوفناک اور نا قابلِ فہم مخلوق ہے۔ وہ تو ویمپائر تک کے سینے کا خون چوس سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ اِس وائرس نے ماحولیاتی توازن کو ضرب پہنچائی ہو۔ پھر بھی یہ افواہیں ہی کہیں جا سکتی ہیں اور افواہوں کو انسانوں کی طرح گھروں میں قید کر کے نہیں رکھا جا سکتا۔ چاہے یہ کتنی بھی نا قابلِ یقین کیوں نہ ہوں مگر یہ افواہ نہیں تھی ایک حقیقت تھی۔ جسے پہرہ دیتے ہوئے پولیس والوں نے بھی دیکھا کہ دن میں مکانوں کی کھڑکیوں کے شیشوں پر اکثر گدھ اور چیلیں آ کر اپنی چونچوں سے ٹکّر مارتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کی چونچیں زخمی ہو جاتی ہیں۔ چونچیں خون میں بھیگ جاتی ہیں، وہ کسی بُو پر پاگل ہو رہے ہیں۔

وہ بُو کس کی ہے؟ انسانی فضلے کی جو اَب اِن گھروں میں ہی سڑ کر زرخیز کھاد بن جائے گا۔ خون کی جس کے کالے اور بڑے بڑے دھبّے جم کر اور خشک ہو کر فرش کے ڈیزائن میں بدل جائیں گے۔ انسان کی بدمزاجی، غصّے، نفرت اور پاگل پن کی جو جلد ہی ہوا بن کر اُڑ

جائے گی۔ یا یہ مَوت کی بُو ہے جو ہمیشہ سے انسان کے بدن سے لپٹی ہوئی ہے۔ اُس کی کھال، گوشت اور ہڈّیوں میں سمائی ہوئی مَوت کی یہ بُو اِن دنوں شدید ہوگئی ہے۔ اِس لیے وہ یہاں آتے ہیں۔ شیشوں پر چونچیں مارتے ہیں۔ وہ دراصل گھروں کے اندر داخل ہونا چاہتے ہیں۔ یہ گھر جو اَب نا قابلِ یقین طور پر اُن نقشوں کے مطابق تیار کیے گئے نظر آنے لگے ہیں جو قبروں کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ ان گھروں میں اب وہی رمز ہے جو قبروں میں ہوتا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب ہر گھر میں ٹیلی ویژن پر صرف ایک ہی فلم چلی رہی ہوتی تھی۔ آج پھر وہ زمانہ لوٹ آیا ہے۔ یہاں ہر گھر میں ایک ہی گندی، بھیانک اور پاگل فلم چل رہی ہے۔

یہ فلورا گارڈن سٹی کا فلیٹ نمبر 13 ہے۔ اُن کی شادی ہوئے ابھی بس ایک ماہ ہی ہوا ہے۔ کچھ ضروری کاموں کی وجہ سے بار بار اُن کے ہنی مون پر جانے کا پروگرام ٹل جایا کرتا تھا لیکن جس وقت ناکہ بندی کا اعلان ہوا، اُسی وقت اُن کی ٹیکسی اسٹیشن سے واپس کر دی گئی اور گھر واپس پہنچ کر مایوسی اور جھنجھلاہٹ کے عالم میں انھوں نے اپنے وہ بند سوٹ کیس کھولے جو دراصل ایک خوبصورت پہاڑی علاقے کے ایک مہنگے ہوٹل کے کسی کمرے میں کھولے جانے کے لیے بند کیے گئے تھے۔ اب کافی دنوں سے وہ گھر میں قید ہیں۔ گھر، جس میں پانی کا نام ونشان نہیں ہے۔ شوہر جو آج سے تین ہفتے قبل تک بے حد اسمارٹ اور صاف ستھرا نوجوان نظر آتا تھا، آج کسی گھٹیا سے موٹر گیراج میں کام کرنے والا مستری نظر آ رہا ہے۔ اُس نے اتنے دنوں سے شیو نہیں کیا ہے اور اُس کی داڑھی بے ترتیبی کے ساتھ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اس لیے اُس کی بیوی کو وقت سے پہلے ہی یہ پتہ چل گیا ہے کہ اُس داڑھی میں کالے بالوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اُس کی اصل عمر پانی کی مستقل غیر حاضری نے ظاہر کر دی ہے۔ وہ نہ جانے کب سے نہیں نہایا ہے۔ اُس کا سر چکٹ گیا ہے۔ سر کے بال تین

رنگ کے ہو گئے ہیں۔ کچھ وہ بال جو ابھی سیاہ ہیں، کچھ وہ جو سفید ہیں اور سب سے زیادہ وہ بال جن پر لگایا گیا رنگ آدھا مٹ چکا ہے اس لیے وہ اُس رنگ کے نظر آنے لگے ہیں جو رنگ بندر کی کھال پر اُگے ہوئے رووٗں کا ہوتا ہے۔ اُس کے کپڑے بہت گندے ہیں اور کپڑوں کے نیچے بنیان، ان سے بھی زیادہ گندی اور پسینے سے بھیگی ہوئی ہے۔ اُس کے بدن سے بدبو آ رہی ہے۔ جسم میں پانی کی کمی ہو جانے کے باعث اُس کے ہاتھ پیروں کی کھال پھٹنے لگی ہے۔ چہرے کی کھال کا بھی یہی حال ہے جسے اُس کی بڑھی ہوئی کھچڑی داڑھی نے ابھی چھپا رکھا ہے۔ اُس کی بیوی ایک کم عمر لڑکی ہے یا اَب سے تین ہفتے پہلے تک کم عمر تھی اور خاصی قبول صورت بھی۔ اُس کے دہانے اور ہونٹوں پر ایک خاص قسم کی معصومیت ہے۔ مگر اَب اُس کے خدوخال پہلے کی طرح نہیں رہے۔ اُس کی رنگت بہت سفید ہے جس میں ایک ایسا سنہری پن بھی شامل ہے جو لیموں کے تازہ اور شاداب چھلکے میں ہوتا ہے، مگر یہ کچھ ہفتے پرانی باتیں ہیں۔ اب اُس کی سفید جلد پر کالے کالے مَیل کے چھپڑ جگہ جگہ جمتے جا رہے ہیں۔ اُس کے سیاہ گھونگھرالے بال اُلجھی ہوئی جوٹ کی میلی رسّیاں بن گئے ہیں۔ گھونگھرالے بالوں کو اگر پابندی کے ساتھ روز نہ دھویا جائے تو اُن میں بہت جلد جوئیں پڑ جاتی ہیں۔ وہ بھی نہ جانے کب سے نہیں نہائی ہے۔ ابھی حال ہی میں گزرے ہوئے ایامِ حیض کے بعد بھی نہیں۔ اس کے بالوں میں جوئیں پڑ گئی ہیں۔ جو دن سے زیادہ رات میں اُس کے دماغ کا خون پینے کے لیے بری طرح رینگتی پھرتی ہیں اور کبھی کبھی بالوں سے گر کر تکیئے اور کپڑوں پر بھی آ جاتی ہیں جنہیں وہ چٹکی سے مسلتی رہتی ہے۔ سر اور بالوں میں اِس قدر کھجلی ہے کہ وہ ہر وقت بالوں میں کنگھا کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے مگر کامیاب نہیں ہو پاتی کیونکہ اُس کے بری طرح اُلجھے ہوئے میلے چیکٹ گھونگھرالے بالوں میں پھنس کر کنگھے کے دانتے ٹوٹ ٹوٹ جاتے ہیں۔ اُس کے جسم میں پسینے اور سڑاندھ کے سوا کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ اُس نے اپنی گندی، پسینے سے بھیگی ہوئی بریسئر اُتار کر پھینک دی

ہے تاکہ سینے اور پیٹھ پر آسانی سے کھجا سکے۔ اُس کے لمبے لمبے ناخنوں میں کالا میل بھرا پڑا ہے اور ایڑیاں پھٹ رہی ہیں۔ ایڑیوں میں بڑی بڑی کھانپیں ہو گئی ہیں۔ اُس کے جسم کا سارا پانی سوکھ رہا ہے۔ بریسئر اُتار کر پھینک دینے کے سبب سے اُس کے بڑے بڑے پستان نیچے کو لٹک آئے ہیں۔ وہ ایک عمر رسیدہ اور کئی بچوں کی ماں نظر آنے لگی ہے۔ اُس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی ہیں اس لیے بات بات پر اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اُس کے خشک اور پھٹتے ہوئے گالوں پر بہنے لگتے ہیں۔ چھوٹی آنکھوں سے آنسو جلدی باہر آتے ہیں۔ بڑی آنکھوں میں پھیل کر وہیں خشک ہو جاتے ہیں۔ اُس کی آنکھیں پیلی بھی ہو رہی ہیں بالکل اُس اُلّو کی طرح جو رات کو کمرے کی کھڑکی کے شیشے سے اُن دونوں کو اپنی پیلی پیلی آنکھوں سے گھورتا ہے۔ جہاں تک پیلے غبار کا سوال ہے تو وہ تو رات میں بھی کم نہیں ہوتا۔ وہ بدستور موجود ہے اور ہوا چلنا بھول چکی ہے۔ ہوا کی یادداشت میں صرف سوکھی ہوئی جھاڑیاں اور ببول کے درخت رہ گئے ہیں جو زمین میں پانی کی کمی سے پیدا ہوتے ہیں اور انتقاماً اپنے اوپر کانٹے اُگا لیتے ہیں۔ وہ اپنی پیلی پیلی آنکھوں میں ہر وقت آنسو لیے گھر میں اِدھر اُدھر چکّر کاٹتی رہتی ہے۔ یہ آنکھیں ہمیشہ ڈبڈبائی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی اُس کے شوہر کی محبت میں ایذا پسندی کا تصور دل ہی دل میں پیدا ہو جاتا تھا۔ وہ اکثر سوچا کرتا اور یہ شادی کی پہلی رات کے بعد سے ہی تھا کہ اگر اُس کی بیوی کے جسم میں خنجر اُتار دیا جائے تو وہ آنسوؤں کے نمکین پانی کے خزانے میں ڈوب جائے گا۔ شاید اُس کی بیوی کے جسم میں خون تھا ہی نہیں۔ وہاں صرف آنسو ہی رگوں میں دوڑتے تھے۔ محبت کے گھنے کالے بادلوں میں نفرت کوندے کی طرح چمک کر لپکتی ہے۔ اِس روشنی میں اشیا اپنے اصل خدوخال میں پہچان لی جاتی ہیں۔ وہ سوچتا کہ اگر اُس کے نازک بدن کو چاقو سے ہلکا سا بھی چھیلا جائے تو وہ کتنا روئے گی۔ اُس کے بدن سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو جائے گا جس میں اُس کی روتی ہوئی آنکھیں بھی بہہ جائیں گی۔ دراصل ہمیں چہرے نہیں دیے گئے ہیں۔ ہمیں صرف

مکھوٹے دیے گئے ہیں۔ ہمیں جذبات کے نام پر غصّہ، چڑ چڑا پن، ایذا رسانی، ہسٹیریا اور پاگل پن ہی مل پائے ہیں۔ محبت اور معافی تو ایسی چیزیں ہیں جو انسانوں کے چکنے دل پر سے ہمیشہ ہی پھسل کر گر جاتی ہیں، بہہ جاتی ہیں۔

آج بھی پانی نہیں آیا۔ شوہر نے پوچھا تھا۔ نہ۔ بیوی نے جواب دیا۔ تم نے پانی کی ٹونٹی کھول کر دیکھی تھی۔ شوہر نے پوچھا تھا۔ ساری ٹونٹیاں کھلی ہوئی ہیں۔ بیوی نے جواب دیا تھا۔ شوہر مایوس ہو گیا تھا۔ حالانکہ اُس کا سوال اور اُس کی مایوسی اِس وقت دونوں ہی احمقانہ تھے۔ یہ وہ جوڑا تھا جو ہمیشہ ایک دوسرے سے لپٹا رہتا تھا۔ ہاتھ میں ہاتھ تھام کر اور دوسرا ہاتھ ایک دوسرے کی کمر میں ڈال کر باہر نکلا کرتا تھا اور جب دیکھو وقت بے وقت مباشرت کرتا رہتا تھا۔ آج دونوں کو ایک دوسرے کے قریب بیٹھ جانے سے بھی پریشانی ہونے لگتی تھی اور شاید ایک دوسرے کے وجود سے ہی چڑ سی محسوس ہوتی تھی۔ اتنی زیادہ جسمانی خواہش اور شہوت کے باوجود ممکن ہے کہ صرف اِس لیے کہ فی الحال وہاں نہ محبت تھی نہ خواہش۔ ویسے بھی محبت ہمیشہ نہیں ہوتی۔ وہ آتی جاتی رہتی ہے۔ آخر محبت کوئی آوارہ مکھّی تو نہیں کہ گندگی کی پوٹلیاں بنے ہوئے دونوں کے جسموں پر آ کر بیٹھ جاتی اور بدنیتی کے ساتھ انھیں چاٹنے لگتی۔

تمھاری چھاتیاں کتنی لٹکی ہوئی اور ڈھیلی ڈھالی ہیں۔ تم نے اپنی عمر غلط لکھوائی ہے۔ تم مجھ سے عمر میں بڑی ہو۔ شوہر نے مرد میں تبدیل ہوتے ہوئے غصّے کے ساتھ کہا۔ وہ رونے لگی۔ تمھیں رونے کے علاوہ کچھ اور بھی آتا ہے۔ وہ اور زور سے رونے لگی۔ یا پھر اگر تمھاری عمر وہی ہے جو تمھاری ماں نے بتائی تھی تو تم شادی سے پہلے کی کھائی کھیلی ہوئی ہو۔ مرد کے لہجے کا زہر آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ جس طرح جسم میں کوئی خطرناک بخار آہستہ آہستہ بڑھتا ہے۔ وہ بھونچکی ہو کر اُسے دیکھنے لگی ہے۔ دیکھ کیا رہی ہو، مجھے تو شادی کی پہلی رات میں ہی شک ہو گیا تھا مگر میں نے دل کو سمجھا لیا۔ خیر رونا بند کرو۔ دیکھو تمھارے اندر

سے کیسی بدبو آ رہی ہے اور یہ کانوں میں بُندے کیوں نہیں ڈالے۔ تمھارے زیور کہاں گئے؟ کیا بیچ کر کھا گئیں؟ چلو بُندے ڈالو کان میں۔ مرد سرد مہری کے ساتھ کہتا ہے۔ کیوں مذاق کر رہے ہیں۔ وہ سسکیاں لیتی ہوئی کہتی ہے۔ اچھا تو میں مذاق کر رہا ہوں، اداکاری کر کے تمھیں رِجھا رہا ہوں۔ مرد چلاّتا ہے۔ واقعی وہ اداکاری نہیں کر رہا ہے کیونکہ ایک اداکار کے لیے سب سے مشکل کام اپنے اندرونی جذبات اور تاثرات کے اظہار کو کامیابی کے ساتھ چھپا لینا ہے مگر مرد کے چہرے پر اُس کے اپنے اصل نجی تاثرات کے علاوہ اداکاری کی ہلکی سی پرت بھی نہیں ہے۔ یہ سخت نفرت اور غصّے سے پاگل ہوتا ہوا ایک نابیدہ چہرہ ہے۔ مرد اُٹھتا ہے اور سامنے سنگھار میز پر رکھی ہوئی ایک سرخ ڈبیہ اُٹھاتا ہے۔ ڈبیہ میں سونے کے چمکتے ہوئے دو خوبصورت بُندے ہیں، وہ بُندے نکال کر اُس کے پاس آتا ہے۔ پہنو— ڈالو کان میں۔ اچھا نہیں ڈالو گی۔ وہ پیچھے کی طرف سرک رہی ہے، اُس کا سر دیوار سے جا لگا ہے۔ مرد ایک ہاتھ سے اُس کی گردن تھام لیتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے اُس کے چھدے ہوئے کان میں بُندہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ نہیں مانتی تو مرد دوسرے ہاتھ سے اُس کے کان کی لَو پکڑ کر پوری طاقت کے ساتھ کھینچتا ہے۔ اور کان کی لَو میں بنے ہوئے ننھے سے سوراخ میں بُندے کا کانٹا پیوست کر دیتا ہے۔ اُس کے منھ سے ایک دردناک چیخ برآمد ہوتی ہے۔ سختی اور بے احتیاطی کے ساتھ ڈالے گئے بُندے کے کانٹے نے اُس کے کان کی لَو کو زخمی کر دیا ہے۔ وہاں سے تازہ تازہ خون رِس رہا ہے۔ ایک ایسا خون جس میں لال رنگ کم ہے اور پیلا زیادہ۔ وہ روئے جا رہی ہے، کچھ تکلیف کے آنسو ہیں، کچھ صدمے کے مگر دونوں آنسوؤں کا رنگ یکسر ایک ہے۔ مرد کے ہاتھ سے دوسرا بُندہ کہیں پھسل کر گر گیا ہے۔ وہ کچھ دیر اُسے ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ بُندہ نہیں ملتا ہے۔ وہ پھر آ کر اُس کے قریب کھڑا ہو گیا ہے۔ شادی سے پہلے تم کون سے بیوٹی پارلر جایا کرتی تھیں؟ میں کبھی نہیں گئی، شادی والے دن دُلہن بنانے کے لیے آئی تھی گھر پر ایک پارلر والی۔ اوہ

اچھا! تم تو شادی کے بعد روز میک اَپ کرتی تھیں، لپ اسٹک لگاتی تھیں۔ خوب سجتی سنورتی تھیں، مجھے رِجھانے کے لیے۔ وہ کیا تھا۔ کیا اَب میں مرگیا ہوں، تم بیوہ ہوگئی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ کو کیا ہوگیا ہے۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ میرا سر درد سے پھٹا جارہا ہے۔ حلق سوکھ گیا ہے۔ وہ پھر زور زور سے رونے لگی ہے۔ اُس کے ایک کان میں بُندہ لٹک رہا ہے، جس پر خون جمتا جاتا ہے۔ دوسرا کان خالی ہے۔ یہ دونوں کان اچانک ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن گئے ہیں۔ جیسے خدا نے اُنہیں ایک چہرے پر نہیں بنایا تھا۔ یہ جڑواں کان نہ تھے۔ یہ بچھڑ کر اِدھر اِس چہرے پر غلطی سے آکر چسپاں ہوگئے تھے۔

رات بڑھ رہی ہے اور مرد کی دیوانگی بھی۔ وہ اُسی طرح کھڑا ہوا اُسے گھورے جارہا ہے تو اَب تمھارا کیا فرض ہے؟ میں تمھارا مجازی خدا۔ نہادھوکر آؤ۔ اچھا پانی نہیں ہے۔ ہاں مجھے معلوم ہے کہ پانی نہیں ہے۔ تو پھر میک اَپ کرو۔ سنگھار کرو۔ پہلے خوب سجو اور پھر میرے ساتھ سوؤ۔ کھچڑی داڑھی میں پوشیدہ مرد کے گال پتہ نہیں کیوں بار بار پھولنے اور پچکنے لگے ہیں۔ دور کسی کلاک ٹاور نے رات کے بارہ بجائے ہیں۔

ٹھیک ہے تم نہیں مانوگی۔ میں لے کر آتا ہوں تمھارا بیوٹی بکس۔ میں سجاؤں گا تمھیں۔ مرد دوڑتا ہوا دوسرے کمرے میں گیا ہے۔ اور اُس کا بیوٹی بکس اُٹھا کر لے آیا ہے۔ دیکھو تمہارے چہرے پر پانی کی وجہ سے کتنی لکیریں ہیں۔ کتنی جھریاں نمایاں ہورہی ہیں۔ یہ ڈی ہائیڈریڈشن ہے۔ یہ نابیدہ چہرہ نئی نئی دُلہن پر کتنا گندا لگتا ہے۔ اور کتنا زرد ہورہا ہے۔ کیا سارا خون ضائع کردیا یا تمھیں یرقان ہوگیا ہے۔ چلو لگاؤ یہ۔ مرد کے ہاتھ میں کوئی شیشی ہے، وہ روتی ہوئی فرش پر لڑھک جاتی ہے۔ میں ہاتھ پیر باندھ دوں گا تمہارے۔ یہ روٹھی ہوئی رنڈی جیسے نخرے مت کر۔ ایسا چہرہ بھیانک ہے۔ شادی شدہ عورت کا ایسا بنجر چہرہ خدا کو بھی پسند نہیں۔ مرد غرّا کر کہتا ہے۔ اور اُس کے سینے پر سوار ہوکر گالوں پر زبردستی بلش لگا دیتا ہے۔ لے لگا کُتیا، لگا۔ اپنی سخت کھردری انگلیوں سے وہ اُس کی پلکوں پر مسکارہ لگاتا

ہے۔ چہرے پر فاؤنڈیشن ملتا ہے اور پھر اُس پر سفید پاؤڈر ڈال دیتا ہے۔ وہ ایذا پسندی کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اپنی موٹی اور بے رحم اُنگلی سے وہ اُس کی روتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں کاجل پوت دیتا ہے۔ وہ اَب رو نہیں سکتی۔ کاجل کی سیاہی سے اُس کی آنکھیں مچ گئی ہیں۔ وہ اَب صرف چیخ رہی ہے اور فرش پر پڑی پڑی اپنی ایڑیاں رگڑ رہی ہے۔ ایڑیاں جن میں پانی کے فقدان کے سبب دراڑیں پڑ گئی ہیں۔ مرد اپنا ایک ہاتھ اُس کی گردن پر اِس طرح رکھتا ہے جیسے گلا گھونٹ دے گا پھر دوسرے ہاتھ سے اُس کے معصوم ہونٹوں پر بہت تیز سرخ رنگ کی لپ اسٹک پوت دیتا ہے۔ اب اچھا لگا نا۔ یہ لے پرفیوم لے۔ بدبو آرہی ہے تجھ میں سے۔ وہ عورت کے میلے کپڑوں اور گندے جسم پر عطر کی پوری شیشی خالی کردیتا ہے۔ گھر میں پہلے سے پھیلی ہوئی بدبو عطر کی خوشبو کے ساتھ مل کر اور بھی ناقابلِ برداشت ہوجاتی ہے جیسے شیطان اور فرشتے۔ کسی گہری سازش کے تحت دنیا کو نیست ونابود کردینے کے درپے ہوگئے ہوں۔ دلہن سج گئی۔ مرد بڑبڑاتا ہے اور اُس سے دور جاکر کھڑا ہوجاتا ہے۔ اُس نے آنکھیں کھول لی ہیں اور چھت کو دیکھے جارہی ہے۔ آنکھوں پر اتنا کاجل لگا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے اُس نے آنکھوں پر کالی پٹّی باندھ رکھی ہو۔ شاید اُس کی آنکھیں بند ہیں۔ نہیں کھلی ہیں۔ اُسے محسوس ہوتا ہے جیسا ہزاروں کی تعداد میں چیونٹیاں آکر اُس کے چہرے پر چمٹ گئی ہیں۔ وہاں ایک خوفناک جلن پڑتی جارہی ہے۔ اور ایک بھیانک خارش۔ کمرے کی کھڑکی پر اُلّو آکر بیٹھ گیا ہے اور اپنی گول گول پیلی آنکھوں سے نہ جانے کس شے کو گھورے جارہا ہے۔ مرد دیوار کی طرف منھ کرکے کھڑا ہوگیا ہے۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے منھ کو چھپا لیا ہے اور بے اختیار رونا شروع کردیا ہے۔ اُسے پیچھے سے دیکھ کر لگتا ہے جیسے کسی زلزلے کی وجہ سے کوئی قدِ آدم پتھر اچانک ہلنے لگتا ہے۔ فرش پر پڑی ہوئی عورت کا چہرہ جو اَب سرکس کے کسی گھٹیا جوکر سے مشابہہ ہے یا کسی سڑک چھاپ ہجڑے سے، کندھوں سے تھوڑا اوپر اُٹھتا ہے پھر نیچے ڈھلک جاتا ہے۔

اُس کے منھ سے پہلے ایک ہچکی کی سی آواز نکلتی ہے۔ پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگتی ہے۔ اُس کی آنکھوں اور جسم میں پوشیدہ آنسوؤں کا سیلاب خشک ہو چکا ہے۔ یہ ہنسی کچھ ایسی محسوس ہوتی ہے جیسے کسی برتن کو، اُس سے بھی زیادہ وزنی دھات کے برتن سے کوٹا جا رہا ہو۔ ایک ایسی آواز جسے زیادہ دیر تک سننے کے بعد کسی کو دل کا دورہ پڑ سکتا ہے۔

آدمی کے وجود میں وہ کون سا تیزاب پوشیدہ رہتا ہے جو اُس کے ہر نیک اور عظیم جذبے کو جلا ڈالتا ہے۔ ہم نئے نئے دائرے بناتے ہیں، پھر خود ہی اُن میں قید ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ ایک نیا دائرہ ہے جس میں قید ہو جانے کے بعد اتنی گندی مایوسی میں اگر کچھ بہتر سوچا جا سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ اگر محبت نہیں ہے تو اِس اجنبی، غلیظ اور خوفناک دنیا میں خدا بھی نہیں ہے کیونکہ خدا محبت کا دوسرا نام ہے۔ انسانوں کا، محبت کا لمس چاہیے۔ اُن کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے خدا چاہیے۔ ورنہ یہ وہ مایوس کن صورت حال ہے جس میں آدمی خدا پر بھی یقین کرنا چھوڑ سکتا ہے۔ شاید یہ ایک خواب ہے جسے انسانوں نے مرنے سے کچھ دیر پہلے دیکھا تھا اور وہ اُن کے تحت الشعور کے کسی ریشے میں پھنسا رہ گیا تھا۔ آج وہی خواب بھٹک کر یہاں آ گیا ہے۔ اُسے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ خواب ہی اپنے آپ کو دیکھ رہا ہے۔ ہمیں اس کے ماٰخذ کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے کیونکہ خوابوں کے ماخذ، خوابوں سے بھی زیادہ گندے اور سیاہ ہوتے ہیں۔ آدھی رات میں باہر پھیلی ہوئی زرد دُھند میں نہ جانے کہاں سے جھنڈ بنا کر جنگلی لومڑیاں چلی آئی ہیں۔ پاگل کتّے سہمی ہوئی اور خوف کھاتی ہوئی آوازیں نکال کر اُن کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ رُک جاتے ہیں کیونکہ جنگلی لومڑیوں کے منھ سے نکلنے والی چیخیں کتوں کی آوازوں سے زیادہ بھیانک ہیں۔ اگر کبھی بارش ہوئی اور اُس میں اتفاق سے دھوپ بھی نکلی ہوئی ہو تو یہ لومڑیاں اپنی شادی رچائیں گی۔ مگر افسوس کہ اِس شادی کو دیکھ لینے والا کوئی شخص زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ ایک خفیہ شادی ہوگی۔ لومڑیوں کی شادی دیکھنا

انسانوں کے لیے منع ہے۔

جنت باغ کے 13 نمبر کے فلیٹ میں ایک تنہا جنونی اور بیمار شاعر رہتا ہے۔ فلیٹ کے اندر سے اکثر اُس کے بڑبڑانے یا بُلند آواز میں کچھ پڑھنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ وہ کسی سے ملتا جلتا نہیں ہے۔ اکثر اُسے کھڑکی یا بالکونی پر کھڑے ہوئے سگریٹ پیتے ہوئے دیکھا جاتا رہا ہے۔ گذشتہ تین ہفتوں سے اُسے کسی نے نہیں دیکھا۔ پولیس والوں نے بھی اُس کی کوئی جھلک کھڑکی پر نہیں دیکھی۔ یہ دِن ایسے ہیں جب کوئی کسی کو نہیں دیکھتا۔ کوئی کسی کو نہیں سنتا۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں ہے۔ ٹیلی فون کے تار کاٹ دیے گئے ہیں۔ کسی کے گھر میں ٹیلی فون کی گھنٹی نہیں بجتی۔ مگر گدھ اور چیلیں دیکھتے بھی ہیں اور سنتے بھی ہیں۔ آدھی رات میں پیلی آنکھوں والے اُلّو سب کی خبر رکھتے ہیں۔

نہیں! مجھے سب معلوم ہے کہ یہ پانی کی بھیانک کمی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ میری نظمیں سوکھ چکی ہیں۔ اِن میں پانی کا قطرہ تک نہیں ہے۔ یہ جو مجھے وہم ہو رہے ہیں۔ التباس ہو رہے ہیں اِن کا سبب خون میں پانی کا ختم ہو جانا ہے۔ یہ وہم ادراک ایک خواب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ تو اچھا ہی ہے کہ خواب میں میرا جسم بھی شامل ہوتا ہے۔ ورنہ بغیر جسم کی روح تو زیادہ گناہ گار ہوتی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میرے جسم میں اب نمک کے چند ذرّات ہی بچے رہ گئے ہیں۔ اس لیے میں اپنے آپ کو مرتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔

شاید یہ میری زندگی کی آخری رات ہو۔ ایک مضحکہ خیز رات جس میں کتّے بار بار بُرے خواب دیکھ کر چونکیں گے، جھرجھری لیں گے۔ ایک بار بھونکیں گے، پھر سو جائیں گے۔ کتوں کو نہیں معلوم کہ انسانوں کے بنائے ہوئے کلینڈر کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ میں دیوار دیکھ رہا ہوں جہاں ایک مکڑی جالا بُن رہی ہے۔ وہ دیوار اور وقت کو ایک ساتھ مٹانے کی کوشش میں ہے۔ میں کچھ اچھی یادوں کی تلاش کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ مگر اب وہ اچھی یادیں نہیں کہی جاسکتی ہیں۔ ان کی اچھائی میں اُجلا پن نہیں ہے بلکہ مَوت کی سفیدی ہے۔ جبکہ بُری یادیں میری کھوپڑی کے وسط میں سوراخ کر کے میرے بھیجے کا سارا خون پینے میں مصروف ہیں۔ کیا زندگی اور مَوت دونوں سے الگ بھی کوئی دنیا ہوگی۔ ابھی میں سو گیا تھا۔ میں نے خواب میں مُردے ڈھونے والی گاڑیاں دیکھیں۔ وہ سب سیاہ رنگ کی اسٹیشن ویگن تھیں اور قطار سے نمبر لگائے کھڑی تھیں۔ ہر گاڑی پر سفید چاک سے لکھا تھا: 'لاش کے واسطے'

کتّے بھونک رہے ہیں۔ میرے کان بیماری میں زیادہ سننے لگے ہیں۔ وہم میں مبتلا ہر شخص کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ میرے کان تو ہمیشہ سے ہی بہت تیز ہیں۔ کتّے بھونک رہے ہیں۔ کتّے کمرے کی دیوار پر آ کر بیٹھ گئے ہیں۔ ان سارے کتّوں کا رنگ پیلا ہے۔ یا میرا جگر خراب ہو گیا۔ جسم میں پانی نہ رہنے کی وجہ سے سب سے پہلے جگر اور گردے ہی خراب ہوتے ہیں۔ سارا آسمان کتوں سے گھرا ہوا ہے۔ سارا آسمان پیلا ہے۔ زرد بادلوں جیسے، رات کے یہ مہیب کتّے۔ یقیناً یہ ایک سگ زدہ رات ہے۔ شاید میری آنکھیں پیلی ہوئیں۔ میری آنکھیں بند ہیں۔ مگر میں اپنی اِن بند آنکھوں سے دیوار پر سب کچھ دیکھ سکتا ہوں۔ دیوار پر تماشہ چل رہا ہے۔ کتنی پرچھائیاں ہیں وہاں اور کتنی روشنی ہے۔ کتنے لوگ سفر پر جا رہے ہیں۔ میرے کمرے سے ٹوائلیٹ کی دوری کتنی ہوگی۔ چاقو کی ایک گندی چبھن میری آنتیں کاٹ کر رکھ دے گی۔ میری ساری دنیا زرد پڑ گئی۔ میری محبت بھی۔ میں گھر میں بالکل اکیلا ہوں۔ میرا اکیلا پن بھی زرد ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ سب دھوکہ ہے۔ فریبِ

نظر ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ گھر میں پانی نہیں ہے اور میری آنکھوں میں نیند نہیں ہے۔ نیند یہاں آنا مشکل ہے۔ سوچتا ہوں بیتی ہوئی زندگی کے کوڑے دان میں جا کر اطمینان سے لیٹ جاؤں اور سو جاؤں۔ مگر سارے کوڑے دان لبالب بھرے ہوئے ہیں۔ اُن میں میرے لیٹنے کے لیے اب جگہ ہی نہیں بچی ہے۔ میرے سر کے عقبی حصّے میں روشنی کے جھماکے ہو رہے ہیں۔ اسی روشنی میں، مَیں اپنے گھر کو دیکھ لیتا ہوں۔ جہاں اتنی بدبو پھیلی ہوئی ہے جیسے ہر کونے میں مرے ہوئے چوہے سڑ رہے ہوں۔ مگر اب میری ناک بند ہوگئی۔ اب میں بدبو نہیں سونگھ سکتا۔ دراصل میری ناک میں وہ خون جم گیا ہے جو کچھ دن پہلے میرے دماغ کی رگ پھٹنے کے باعث نکلا تھا مگر کوئی بات نہیں۔ مجھے یہ بدبو نظر آ رہی ہے۔ میں یہ بدبو سونگھ نہیں سکتا، مگر دیکھ تو سکتا ہوں۔ میری بند آنکھیں، میری بند ناک کی مدد کر رہی ہیں۔ ایسا ہی ہونا چاہیے، یہی تو آپسی محبت ہے۔ میں نے بہت پہلے اپنی محبت کو کھو دیا۔ میں اُس کے گھر جانا چاہتا ہوں۔ وہاں جہاں سب کے گھر ختم ہو جاتے ہیں۔ آبادی ختم ہو جاتی ہے۔ تب بہت دور چلنے کے بعد، کئی موڑ مڑنے کے بعد اُس کا گھر آتا ہے۔ یہی گھر تو میرا بھی تھا۔ یہاں اندھیرا بہت ہے اور میں سمت بھول جانے کا پرانا مریض ہوں۔ ہر گناہ گار کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ وہ اپنے گھر جانے کی سمت بھول جائے تا کہ جہنّم کے سپاہی گھر میں جانے سے پہلے ہی اُسے گرفتار کر کے لے جائیں اور جہنّم کی آگ کے سپرد کر دیں۔ پانی نہیں آ رہا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے اور تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ مجھ سے اُٹھا کیوں نہیں جاتا۔ کب سے بستر پر پڑا ہوں۔ ریڑھ کی ہڈی دُکھ گئی، مگر جب اُٹھ جاتا ہوں تو سیدھا لوہاروں والی گلی میں چلا جاتا ہوں۔ اِس گلی میں تو میری محبوبہ رہتی ہے۔ اس گلی میں ہر طرف آگ ہی آگ دہک رہی ہے جس میں لوہا تپ رہا ہے۔ میں نے اپنی وہ نظم بھی اِسی آگ میں ڈال دی۔ جو میں نے اُس کے لیے لکھی ہے۔ آگ میں میری نظم بھی تپتا ہوا لوہا بن جائے گی۔ میں نے اُس سے کہا تم سے پہلے میں کسی

عورت کو جانتا تک نہیں تھا۔ اُس نے کہا میں تم سے پہلے کسی مرد کو جانتی تک نہ تھی۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ پہلے عورت اور مرد ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں پھر آہستہ آہستہ وہ ایک دوسرے کو وہ سب سکھانا شروع کر دیتے ہیں جو وہ ازل سے ہی جانتے ہیں۔ شاید سبق سکھانا اسی کو کہتے ہیں۔ اس جاننے اور سیکھنے کے درمیان ایک گندے پوکھر میں محبت ایک بغیر سنّوں والی بدنصیب مچھلی کی طرح پھڑ پھڑاتی رہتی ہے اُسے پتہ نہیں کہ اُس کی چکنی جلد کے لیے اُسے کبھی معاف نہیں کیا جائے گا۔ مگر مجھے پسینہ بالکل نہیں آ رہا ہے۔ آئے بھی کہاں سے، بدن میں پانی ہی نہیں ہے۔ بس اب کھال پھٹ کر خون باہر آنے کی دیر ہے۔ ہونٹ دیکھو، کیسے پھٹ گئے ہیں۔ زبان جکڑ گئی ہے ورنہ ہونٹوں پر پھیر لیتا۔ اِس وقت اُس کے نرم گیلے ہونٹوں کا ایک بوسہ ہی میری جان بچا سکتا ہے۔ نہیں مجھے معلوم ہے کہ یہ سب میرا اوہم ادراک ہے اور کچھ نہیں۔ پانی کبھی تو آئے گا، پانی مر نہیں سکتا۔ پانی سب کو غرق کر سکتا ہے مگر خود اپنے آپ کو نہیں۔ پتہ نہیں پانی کے مسئلے پر ملک میں جو مختلف صوبائی تنازعے چل رہے ہیں اُن کا کیا ہوا۔ کس صوبے کو زیادہ پانی ملا اور اُس ڈیم کا کیا ہوا جس نے ایک پورے شہر کو ڈُبو کر رکھ دیا تھا۔ شاید کل سپریم کورٹ فیصلہ سنا دے۔ میں بھی تو سپریم کورٹ کا ایک جج ہوں۔ مگر مجھے یہ سب جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ وہ جو کسی نے کہا تھا کہ علم کے جنگل سے سُور کی طرح منھ لٹکائے ہوئے ہی واپس آیا جا سکتا ہے۔ ایک مچھر لگاتار میرے کان میں نوحہ سنائے جا رہا ہے۔ یہ میری کھڑکی کے شیشے پر آگ کا سایہ کیسے منڈلایا۔ شاید باہر پولیس والوں نے ایک پاگل کتّے پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی ہے۔ وہ جانور دھڑا دھڑ جل رہا ہے۔ اُس کا جلتا ہوا سایہ بگولے کی طرح ناچ رہا ہے۔ ویسے یہ سب پانی کی وجہ سے ہے۔ یہ فریبِ نظر ہے۔ کیا پانی آ گیا۔ دیکھوں تو جا کر۔ چلو بعد میں دیکھوں گا۔ ابھی تو میں ایک ایسے جنگل میں ہوں جہاں نہ درخت ہیں نہ گھاس۔ اصل جنگل تو یہی ہے جہاں جانور ننگے گھوم رہے ہیں۔ زیبرے کی خوبصورت

دھاریاں سوکھ کر پپڑی بن کر اُس کے جسم سے گر گئی ہیں۔ میں خدا میں پورا یقین رکھتا ہوں اِس لیے دنیا میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں خدا کی خاموشی سے پریشان ہوں۔ اگر میں خدا کو نہ مانتا ہوتا تو دنیا میری سمجھ میں آ جاتی۔ یہ ایک فائدہ تھا کہ پھر تنہائی، خوف اور بے رحمی سب شفاف ہو جاتیں اور مَوت آسان اور زندگی اُس کے ہونٹوں کی طرح میٹھی اور مزیدار۔ پھر زندگی اور مَوت کے درمیان خدا نہ ہوتا۔ کسی بھی مطلق سچائی کو نہ تسلیم کرنے میں ہی نجات ہے۔ مگر یہ سوچنا گناہ ہے۔ میں اس لیے یہ سوچ رہا ہوں کہ میرے اندر سوکھا پڑ گیا ہے۔ جو کوئی اتنی بڑی بات نہیں۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ پانی کا ارتقا ندیوں اور سمندروں میں نظر آتا ہے۔ ایک شاندار اِرتقا۔ مگر ہمیں اُس پانی سے ہوشیار رہنا چاہیے جو چھپ چھپ کر، گہرے گڈھے، کنوئیں اور باوَلی میں رہتا ہے۔ یہ ایک ایسا پانی ہے جس کے دل میں بُغض بھرا ہوا ہے۔ چھپی ہوئی چیزوں سے ہوشیار۔ مجھے بھوک لگنا بند ہو گئی ہے اور پیاس بھی نہیں لگتی۔ پیاس کے لیے ایک گلا ہونا ضروری ہے اور اُسے میں لوہاروں کی گلی میں بھول آیا ہوں۔ اب مجھے چلنا چاہیے۔ یہ کتّے تو بھونکتے ہی رہیں گے۔ یہ خدا کی بنائی ہوئی اصل دنیا نہیں معلوم ہوتی۔ یہ اصل دنیا کی پیروڈی ہے۔ شیطان کی لکھی ہوئی پیروڈی۔ مجھے خدا کے پاس جانا ہے۔ خدا کی اصل دنیا میں ہی مجھے پانی ملے گا۔ ہلکورے مارتا ہوا پانی۔ آبِ حیات بھی وہیں۔ یہاں تو آبِ مرگ یا آبِ فنا تک کا ایک قطرہ نہیں بچا ہے۔ مجھے احساس ہو چلا ہے کہ میرا یہ کہنا یا ارادہ کرنا ایک خنجر کو پانی کے اندر چلانے جیسا ہے۔ اور یہ سب میرے جسم کی نابیدگی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ میرا جسم گیلی گولیے کی طرح کب کا نچوڑا جا چکا اور اَب ایک سوکھی جھلّی کی مانند الگنی پر لٹکا ہوا ہَوا میں ہل رہا ہے۔ ایک خنجر پانی کے اندر چاقو کا ایک وار پانی کے اوپر، رائیگاں، بیکار۔ وہ ڈوب گیا۔ بس مچھلیاں پانی کے اندر اپنا راستہ بھول گئی ہیں کیونکہ اس بار مچھیرے جال لے کر نہیں آئے ہیں۔ اُن کے ہاتھوں میں کھلے ہوئے چاقو دبے ہیں۔

دُور، بہت دور، گھروں میں ساری روشنیاں بند کر دی گئی ہیں۔ وہاں مدھم لَو والے چراغ روشن کر دیے گئے ہیں۔ جن میں بجلی کی کمینگی اور شیطینیت کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ یہ ایک پاکیزہ روشنی ہے جس میں نیک روحیں دوبارہ جنم لیتی ہیں۔ نیکی بدی پر فتح پانے کے لیے اپنے گھر سے نکل کھڑی ہوئی ہے۔ پیلے غبار کی چھت کے نیچے سوتا ہوا یہ شہر جلد ہی جاگنے والا ہے۔

کیا پانی آ گیا۔ کیا پانی آنے والا ہے۔ مرنے سے پہلے میں نے اُسے دور سے آتا ہوا دیکھ لیا اور اُس کی آواز سن لی۔ اب سب کچھ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ جس طرح آنکھ آہستہ آہستہ اپنی روشنی گنواتی ہے۔ جس طرح دق پھیپھڑوں پر آہستہ آہستہ جمتی ہے۔ مجھے بخار ہے — تیز بخار۔ اِس بخار پر کوئی بالٹی بھر کر پانی ڈال رہا ہے۔ کیا یہ سچ ہے کہ پانی آ گیا۔ مگر سچ ہے کیا۔ کتنے راستے ہیں جو اُس کے گھر جاتے ہیں مگر سچ ایک ایسا کرایہ دار ہے جو زیادہ دن ایک مکان میں نہیں ٹھہرتا۔ نقلِ مکانی اُس کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ میں نے پانی کو آتے ہوئے دیکھ لیا ہے، پانی ننگے پیر آ رہا ہے۔ میں نے پانی کی کمی کی وجہ سے اپنے جسم کو مر جانے کے لیے راضی کر لیا ہے۔ میں پانی پر اپنا خون معاف کرتا ہوں۔

اُس نے اپنے بچپن سے ہی یہ کام سیکھ لیا تھا، جب وہ اپنے باپ کے ساتھ جگہ جگہ ٹیوب ویل اور ہینڈ پمپ لگوانے جایا کرتا تھا۔ اُس کا خاندان نل والوں کا خاندان کہا جاتا تھا کیونکہ اِس خاندان اور کنبے کے تمام افراد ایک زمانے سے یہی کام کرتے چلے آرہے تھے۔ اُس کا باپ بہت عمدہ مستری تھا۔ گاؤں سے لے کر شہر تک اُس کی شہرت تھی۔ وہ سوکھی سے سوکھی زمین سے بھی پانی کھینچ کر لے آتا تھا۔ یہاں تک کہ پتھریلی زمین سے بھی۔ زمین میں اُس کے گاڑے ہوئے نل بہت مشکل سے ہی خراب ہوتے تھے۔ باپ کی مَوت کے بعد اُس نے اپنا موروثی کام سنبھال لیا اور اُسے بخیر وخوبی انجام دینے لگا۔ جب سے پائپ والے پانی کا رواج بڑھا تھا۔ اُس نے یہ کام بھی سیکھ لیا تھا۔ شہر میں نئی تعمیر ہونے والی کالونیوں میں بورنگ کرنے، نل لگوانے اور اُن کی مرمت وغیرہ کے لیے اُسے بلایا جانے لگا تھا۔ وہ ایک ماہر پلمبر بن گیا تھا۔ لائف اپارٹمنٹس اور اُس کے اطراف کی کالونیوں میں بورنگ کرنے والے مستریوں میں وہ بھی شامل تھا۔ جن کو ٹھیکے دار نے نوکری پر رکھ لیا تھا۔
اُس کا گاؤں کالی ندی کے پُل کے مغرب میں واقع چاند ماری کے میدان سے ملا ہوا تھا۔
چاند ماری کا میدان اب مکمل طور پر ملٹری کے ممنوعہ علاقے میں شامل کر لیا گیا تھا۔ مگر بچپن میں وہ اپنے باپ کے ساتھ سائیکل پر بیٹھ کر چاند ماری کا میدان دیکھنے جایا کرتا تھا۔ جہاں

فوج کے افسر اور سپاہی نشانے بازی کی مشق کیا کرتے تھے۔ اُسے وہ سرخ رنگ کی اونچی فصیل آج بھی یاد ہے جو کسی چھوٹے سے قلعے کی دیوار کی طرح لال پتھروں کی بنی ہوئی تھی اور جس پر جگہ جگہ کارتوسوں کے نشان پڑے ہوئے تھے۔ وہاں کے فوجی لوگ بھی اُس کے باپ کو پہچانتے تھے اور اُس کے سلام کا جواب مسکرا کر دیا کرتے تھے۔ اُس کا باپ فوجی علاقے میں بھی اکثر نل لگانے یا بورنگ کرنے کے لیے بلایا جاتا تھا۔ مگر جب سے اِس علاقے کو ممنوعہ قرار دے دیا گیا ہے اور اُس کے چاروں طرف کانٹوں دار تار کی گھیرا بندی کر دی گئی ہے، تب سے عام آدمی کا اِس علاقے میں آنا بند ہو گیا ہے۔
یہ بہت اچھی بات تھی کہ بیماری ابھی اُس کے گاؤں نہیں پہنچی تھی، مگر اُسے رات میں نیند آنا بند ہو گئی تھی۔ وہ جاگتا رہتا اور سوچتا رہتا کہ پائپ لائن بچھانے کا اور بورنگ کرنے کا کام تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوا تھا، پھر یہ پانی آخر گندا کیسے ہو گیا۔ اُس کے کام میں تو کبھی کوئی شکایت آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ آج صبح تڑکے، جب پو پھٹ رہی تھی وہ ٹہلتا ہوا اپنے گاؤں سے آگے چاند ماری کے میدان کے پیچھے سے ہوتا ہوا، کالی ندی کے کنارے کنارے دور تک نکل گیا۔ اِن دنوں وہ بیکار تھا۔ شہر میں ناکہ بندی چل رہی تھی۔ اس لیے وہ بے فکری کے ساتھ صبح صبح ٹہلنے نکل جایا کرتا تھا۔ آج ٹہلتے ٹہلتے بے خیالی میں وہ بہت آگے نکل آیا۔ وہاں جہاں اینٹوں کے بھٹّے کی چمنی دُھواں دیتی ہوئی نظر آتی تھی اور جہاں کالی ندی نے ایک بڑا سا موڑ کاٹا تھا۔ اور اُس کے کراڑے اونچے ہوتے چلے گئے تھے۔ ندی کے کالے پانی میں جگہ جگہ سیوار اُگ آیا تھا اُڑی ہوئی ہری رنگت کا سُرخی مائل سیوار۔ کچھ دیر پہلے طلوع ہوئے سورج کی کرنیں جب ترچھی ہو کر اس سیوار پر پڑیں تو پل بھر کو اسے دھوکہ ہوا جیسے کالی ندی میں نہ جانے کہاں سے بہت پرانا جما ہوا خون بہتا ہوا چلا آرہا ہے۔ دور دور تک ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ چند مویشی ضرور ندی کے اُس پار گھوم رہے تھے۔ وہ یونہی چلتا رہا۔ کچھ دور کے بعد۔ آگے جا کر درختوں کا ایک گھنا جھنڈ ندی پر جھک آیا

تھا۔ یہاں بے شمار کوّے بول رہے تھے۔ ندی کے اس حصے کی طرف شاید ہی کوئی کبھی آتا ہو کیونکہ یہی وہ جگہ تھی جہاں ندی میں بہہ کر آنے والی لاوارث لاشیں درختوں کے اس گھنے جھنڈ میں پھنسی ہوئی پائی جاتی تھیں۔ گاؤں والے اِدھر آتے ہوئے ڈرتے تھے۔
چاند ماری کے میدان میں فائرنگ ہونے لگی۔ اُسے اندیشہ ہوا کہ کوئی گولی اِدھر کو نہ آ بھٹکے۔
وہ تھوڑا اٹھٹکا پھر آگے بڑھنے لگا۔ بڑھتا ہی رہا یہاں تک کہ اُسے وہ اونچا کٹیلا تار نظر آنے لگا جس کے ذریعے ملٹری کے ممنوعہ علاقے کی گھیرابندی کر دی گئی تھی اور جس پر جگہ جگہ سرخ بورڈ ٹانگ دیے گئے تھے جن پر 'ممنوعہ علاقہ' موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا۔ اُس نے اپنی جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال کر ایک بیڑی سلگائی اور تبھی اُس کی نظر کانٹوں دار تار کی فصیل کے اُس پار بجلی کے ایک ہائی ٹینشن ٹاور پر پڑی۔ اُس نے دیکھا کہ ٹاور کے اوپر بجلی کے تاروں کے جال میں سے ایک لمبا تار ٹوٹ کر کالی ندی کے کنارے ایک گڈّھے میں گر پڑا تھا۔ اُس نے اپنا چارخانے والا تہبند گھٹنوں تک چڑھا لیا اور جلدی جلدی گڈّھے کی طرف قدم بڑھائے۔ وہاں پہنچتے ہی اُس کی ناک سڑ گئی۔ بہت بدبو تھی۔ گڈّھے میں نہ جانے کب سے پانی سڑ رہا تھا۔ جس میں مویشیوں کی لاشیں تقریباً ڈھانچوں میں تبدیل ہو کر تیر رہی تھیں۔ یہ بہت بڑا گڈّھا بن گیا تھا۔ مویشیوں کی لاشوں کو گدھ نوچ رہے تھے۔
اُس نے بیڑی کا ایک گہرا کش لیا اور اُسے پھینکتے ہوئے اپنے انگوچھے سے منہ پر ڈھاٹا باندھ لیا اور تھوڑا اور آگے بڑھتا ہوا گڈّھے کے آس پاس کی زمین کا جائزہ لینے لگا۔ اور تب اُسے وہ نظر آ گیا۔ گڈّھے سے بالکل ملا ہوا۔ سیور لائن کا کالے رنگ کا موٹا سا پائپ جو جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور اُس میں دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ گہرے گہرے سوراخ بھی بن گئے تھے۔ اُسے اچھی طرح علم تھا کہ یہاں سے صرف دو فیٹ کی دوری پر پینے والے پانی کی لائن بھی گزرتی تھی۔ اُسے سب سمجھ میں آ گیا۔ ہائی ٹینشن ٹاور کے اِس تار نے زمین کے اندر گہرائی میں ڈالے گئے سیور لائن کے اس پائپ کو برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ بڑا سا

گڈّھا اِس بجلی کے گرنے اور زبردست دھماکے سے ہی وجود میں آیا ہوگا۔ یہاں اُس وقت جو مویشی ٹہل رہے ہوں گے وہ اِس بجلی کی زد میں آ کر جل کر مر گئے ہوں گے اور گڈّھے میں دفن ہو گئے ہوں گے۔ گڈّھا زمین میں ہوئے ایک دیوقامت زخم کی شکل میں نظر آتا تھا۔ یا ایک بہت بڑی قبر کی طرح جس کے رمز کو سمجھنا مشکل ہے۔ صرف عذابِ قبر کے فرشتے ہی اس سے واقف ہیں یا قبر میں لیٹے ہوئے مُردے۔ پانی پر جھک کر اُس نے یونہی اپنا چہرہ دیکھنا چاہا مگر جانوروں کی لاشوں اور اُن کے پنجروں میں اُس کے چہرے کا عکس کہیں پھنس کر رہ گیا۔ کالی ندی اکثر اپنے کناروں سے باہر بہنے لگتی ہے۔ چاہے برسات کا موسم نہ بھی ہو۔ یقینی طور پر جہاں یہ گڈّھا ہے وہاں ندی کا پانی اکٹھا ہو گیا ہوگا یا پہلے ہی سے کیچڑ اور دلدل رہی ہوگی۔ بجلی کے ساتھ جب پانی ملا ہوگا تو جو قیامت آئی ہوگی اُسے کسی نے نہیں دیکھا۔ اُسے تو صرف اُن بدنصیب مویشیوں نے ہی دیکھا جن کی لاشیں گڈّھے میں سڑ رہی ہیں اور چاروں طرف جراثیم ہی جراثیم ہیں۔ اگرچہ وہ ننگی آنکھ سے نظر نہیں آتے۔ بجلی اور پانی جب زیادہ غصّہ ور ہو کر بغل گیر ہوتے ہیں تو یہی ہوتا ہے۔ زمین بھی آگ کا گولہ اسی طرح بنی تھی اور ہم کیا یہ سمجھتے ہیں کہ اب اُس کی آگ کم ہو گئی ہے؟

تو یہ تھا اُس پُراسرار بیماری کا راز — اُس کا ماخذ یا مرکز۔ ماخذ ہمیشہ گندے ہوتے ہیں چاہے وہ انسانوں کے ہوں یا کسی اور شے کے۔ بڑے بڑے سائنسی ادارے اور اُن کی ٹیمیں، ڈاکٹر، انجینئر جس خرابی کا پتہ نہ لگا سکے اُسے ایک معمولی نل والے نے کھوج لیا۔ ایک غریب پلمبر نے۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا واپس آنے لگا۔ اُسے شہر جانا ہے۔ پولیس کو مطلع کرنا ہے پھر اُسے اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن تک پہنچنا ہے۔ اُنہیں یہ خوش خبری سنانا ہے کہ یہ محض ایک تکنیکی خرابی تھی۔ ملٹری پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ انہوں نے میڈیا تک یہ خبر پہنچنے ہی نہ دی ہوگی کہ اُن کے ممنوعہ علاقے میں ہائی ٹینشن تاروں کے آپس میں اُلجھ

جانے کے باعث کبھی بجلی گری تھی۔ نئے تار لگا کر فیوز جوڑ دیے گئے تھے۔ یہ وہی تکنیکی خرابی ہے کہ جس کا تعلق انسانوں کے نصیب سے بہت گہرا ہے۔ ایک نادیدہ تعلق جس کے ذریعہ یہ خرابیاں انسانوں سے اپنا رشتہ ہمیشہ استوار رکھتی ہیں۔ اگرچہ ہمیں انتظار کرنا پڑتا ہے اُس وقت کا جب ہم ٹھنڈی سانس لے کر یہ کہیں گے یہی مقدر تھا۔ پتہ نہیں اس تکنیکی خرابی کے باعث وہ سب شہید ہوئے یا کتّے کی موت مرے یا کتوں سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ اس بارے میں کچھ بھی وثوق کے ساتھ کہہ پانا ہمیشہ مشکل ہی رہے گا۔

وہ شہر کی طرف دوڑتا جاتا ہے۔ اپنا تہبند گھٹنوں تک چڑھائے۔ کیچڑ، پانی سے لت پت گڈّھے پھلانگتا ہوا، گرتا پڑتا وہ ننگے پاؤں بھاگتا جاتا ہے۔ اُس کی چپّلیں کہیں راستے کی دلدل میں پھنس گئیں۔ اور اُس کے ننگے پیروں کے نیچے کئی مینڈک کچلتے کچلتے بچ گئے۔ وہ غریب مستری جو آج آرکامیدس سے کم نہیں۔ اُسے اِس سے بھی زیادہ تیز اور دیوانہ وار دوڑنا چاہیے۔ اخباروں میں اُس کی تصویریں شائع ہوں گی اور ٹی.وی. چینل والے اُس کا انٹرویو لیں گے۔ اُس کے بیوی بچے خوشی سے پاگل ہو جائیں گے۔ کالی ندّی پر بنا ہوا وہ پرانا سفید کنگورے دار پُل اب اُسے نظر آنے لگا ہے۔

ٹی.وی. کے ایک مشہور نیوز چینل پر چشمہ لگائے خوبصورت آنکھوں والی ایک رپورٹر ضلع اسپتال کے ایک نوجوان مگر ذمہ دار ڈاکٹر کا انٹرویو لے رہی ہے۔ لڑکی نے اپنے بالوں کا جوڑہ باندھ کر اُن میں ایک سُرخ گلاب لگا رکھا ہے اور ڈاکٹر نے آج اپنی سب سے زیادہ قیمتی چاکلیٹی رنگ کی چارخانے والی قمیص پہن رکھی ہے۔ دونوں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ درمیان میں ایک شیشے کی میز ہے جس پر ایک گل دستہ اور کافی کے دو کپ رکھے ہوئے ہیں۔

آپ لوگوں کا یہ کارنامہ قابلِ ستائش ہے اور تاریخ میں اسے یاد رکھا جائے گا۔ آپ ہمارے ناظرین کو اس بارے میں کیا بتانا چاہیں گے۔ لڑکی مسکرا کر انٹرویو شروع کرتی ہے۔ ڈاکٹر بھی جواباً مسکراتا ہے۔ پھر کہنا شروع کرتا ہے۔ شکریہ۔ یہ سب سخت محنت اور جدوجہد کے سبب ممکن ہوا ہے۔ ہم نے دن رات محنت کر کے، مطالعہ کر کے اور تحقیق کر کے بالآخر اِس امر کا سراغ لگا لیا کہ یہ کوئی وائرس نہیں تھا۔ یہ کالرا کا ایک معمولی بیکٹیریا تھا۔ مگر کالرا کا علاج تو اَب عام ہے۔ لڑکی نے پوچھا۔

سنئے — پوری بات سنئے کہ بیکٹیریا تو وہی پرانا تھا مگر اب انسان بدل گئے ہیں۔ ان کے جسموں کے نظام میں بڑی تبدیلی آ گئی ہے۔ اُن کی قوتِ مدافعت کی ساخت بھی بدل

رہی ہے۔ اور اُس کا عملی نظام بھی۔ اب اس بیکٹیریا کے تئیں انسانی جسم مختلف ردّعمل پیش کررہے تھے۔ اُن کے جسم میں بننے والی اینٹی باڈیز باہر سے آئے ہوئے اُس اینٹی جن کا مقابلہ نہیں کر پا رہی تھیں۔ علاج کے دوران دوائیاں اپنا اثر اس لیے نہیں دکھا رہی تھیں کہ مریضوں کے جسم انہیں اپنا تعاون نہیں پیش کررہے تھے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ مریض کا اپنا تعاون کتنا ضروری ہوتا ہے۔

آپ کو یہ کب معلوم ہوا کہ یہ وائرس نہیں ہے؟ لڑکی نے سوال کیا۔

کافی دن پہلے ہی معلوم ہوگیا تھا مگر جب تک کونسل آف میڈیکل ریسرچ والوں نے دوا ایجاد نہیں کرلی۔ ہم نے میڈیا سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ ڈاکٹر نے کافی کا کپ اُٹھا لیا۔

تو اَب کون سی دوا تجویز کی گئی ہے؟ لڑکی مسکرا کر پوچھتی ہے۔

کوئی خاص نہیں۔ پہلے سے تجویز کردہ کالرا کے اینٹی بائیوٹک یعنی ڈوکسی سائیکلین کو سی فاکزیم جیسے اینٹی بائیوٹک کی مناسب مقدار میں ملا کر دینے سے سارے مریض صحت یاب ہو رہے ہیں اور یہ دوا بجائے پانی کے لیموں یا سنترے کے عرق کے ذریعے دی جائے تو اور بھی بہتر نتائج سامنے آ سکتے ہیں۔ اگر درمیان میں مریض کو بید کے درخت کی چھال کو پیس کر تھوڑے پانی میں ملا کر دیتے رہیں تو سر کے اُس درد سے بھی نجات مل جائے گی جو ڈی ہائیڈریشن کی وجہ سے ہے۔ بیدِ مجنوں کی چھال دنیا کی سب سے پرانی اور پہلی دوا ہے۔ مریض اب ٹھیک ہو کر واپس گھر جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا۔ اس وبا کے پھیلنے کی روک تھام کے سلسلے میں سرکار نے جو حفاظتی اقدام اُٹھائے۔ شہر کی ناکہ بندی وغیرہ وغیرہ۔ وہ سب بہت مستحسن ہے اور یہ بھی خوش آئند بات ہے کہ ناکہ بندی ختم کردی گئی ہے۔ کالی ندی کے پُل پر سے پولیس کا پہرہ ہٹا دیا گیا ہے۔ لوگ اب گھروں میں بند نہیں رہیں گے۔

مگر جن علاقوں میں پانی کی سپلائی روک دی گئی تھی وہاں کیا حال ہے۔ لڑکی نے بھی کافی کا کپ ہاتھ میں لے لیا ہے۔

دیکھئے اس بارے میں تفصیل کے ساتھ تو آپ کو ضلع کے حکام ہی بتا پائیں گے۔ مگر بات یہ ہے کہ پانی بالکل ٹھیک تھا، صاف تھا۔ سیورلائن میں کوئی خرابی نہیں پائی گئی۔ پانی کا کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ سپلائی روک دینا محض ایک احتیاطی تدابیر تھی۔

تو وہاں کے لوگوں نے جو بدبودار پانی کی شکایت درج کرائی تھی؟ لڑکی نے پوچھا۔

ڈاکٹر کو پسینہ آنے لگا۔ اُس نے رومال سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ دیکھئے، اصل میں کسی کو باہر کا کچھ اُلٹا سیدھا کھانے سے کالرا ہوا ہوگا۔ اور چونکہ اس بار کا کالرا شدید طور پر چھوت چھات کے ذریعے پھیلنے والا تھا۔ اِس سے کسی ایک کے بیمار ہوجانے سے اُس کے گھر والوں اور پڑوسیوں تک بھی یہ بیماری پھیل گئی ہوگی۔ رہی بات پیلے اور بدبودار پانی کی، تو کالونی کے کسی ایک گھر کی ٹنکی کی صفائی عرصے سے نہیں کی گئی ہوگی۔ کچھ بدبو والا وہاں آ گیا ہوگا، مگر آپ جانتی ہیں اس ملک میں افواہوں پر کتنا یقین کرتے ہیں لوگ۔ یہ ایک بھیڑ چال ہے جس میں سب کو اپنے گھر کا پانی پیلا اور بدبودار نظر آنے لگا۔ اب دیکھئے نا باہر کتنا زبردست پیلا پیلا غبار چھایا ہوا ہے۔ اُس کے عکس میں یہاں بھی سب پیلا ہی نظر آ رہا ہے۔ مجھے تو یہ کافی بھی پیلی نظر آ رہی ہے۔ جی ہاں!

لڑکی ہنستی ہے۔

ڈاکٹر بھی ہنستا ہے اور کہتا ہے۔ سب لوگ دراصل پانی پر اِس غبار کا عکس دیکھ کر خوف اور وہم میں مبتلا ہوگئے۔ اصل میں ہر شخص کو تو آج کے زمانے میں ڈپریشن ہے۔ نفسیاتی علاج کی بھی ضرورت ہے اِن لوگوں کو۔ آپ نے سوزن سوتانگ کی کتاب Illness as Metaphor اب تک تو پڑھ ہی لی ہوگی۔ زیادہ تر لوگ اِیسے ہی ہیں۔ اپنے دماغ سے سوچتے ہی نہیں ہیں اور بدبو کا تو معاملہ یہ ہے کہ ہمارے گھروں میں صفائی رکھنے کا بہت کم رواج ہے۔ مگر دیکھئے پھر بھی ہمارے انتظامیہ نے ان وہمی لوگوں کی شکایت پر احتیاط کے طور پر پانی کی سپلائی بند کردی تھی اور اِس بات کی جتنی بھی تعریف کی جائے، وہ کم ہے۔

ایک آخری سوال وہ یہ کہ اب اُن اطراف میں پانی کی سپلائی کھول دی گئی ہے۔لڑکی نے پوچھا۔

جی ہاں۔ضلع مجسٹریٹ نے بیان دیا ہے کہ آج صبح سے ہی وہاں پانی کھول دیا گیا ہے۔ڈاکٹر نے جواب دیا۔

جی۔تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ پانی میں کوئی بیماری تھی اور نہ یہ پانی سے پھیلی اور نہ ہی پانی کی پائپ لائن یا سیور لائن میں کوئی خرابی تھی۔جس کا شبہ ظاہر کیا جارہا تھا۔خوبصورت آنکھوں والی لڑکی نے گویا ٹی.وی. دیکھنے والوں سے کہا۔

جی بالکل نہیں،کوئی خرابی نہ تھی۔ڈاکٹر نے جواب دیا۔

آپ کا ہمارے اسٹوڈیو میں آنے کا شکریہ۔لڑکی نے کہا۔

آپ کا بھی شکریہ۔ڈاکٹر نے کہا اور انٹرویو ختم ہوگیا۔

ٹی.وی. پر اِس انٹرویو کے ختم ہو جانے کے فوراً بعد خبریں سنائی اور دکھائی جانے لگیں۔ یہ قومی اور بین الاقوامی نوعیت کی بہت اہم خبریں تھیں۔انہیں اہم خبروں کے ساتھ ٹی.وی. کے اسکرین پر نیچے بالکل نیچے حاشیے پر بھی ایک خبر آرہی تھی جسے نہ کسی نے پڑھا نہ دیکھا۔وہ خبر کچھ اس طرح تھی۔آج صبح ملٹری کے ممنوعہ علاقے میں ایک نل لگانے کا کام کرنے والا مستری غیر قانونی طریقے سے جا گھسا۔اور چاند ماری کے میدان میں ہونے والی فائرنگ کی مشق کے دوران ایک گولی اُس کے سر پر جا لگی۔اُسے فوراً ملٹری اسپتال لے جایا گیا، جہاں اُس کی موت ہوگئی۔لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا ہے۔

سب سے پہلے وہ کسی ننھی سی چڑیا کی آواز محسوس ہوئی۔ پھر ایک تیز ہوا کے جھونکے جیسی اور اُس کے بعد کسی پاکیزہ روحانی گیت کے آلاپ کی طرح۔ پھر وہ گیت ہر گھر میں پانی کی ٹونٹیوں سے بہہ نکلا۔ صبح صبح اُن کے گھروں میں پانی کی ندیاں آنکلیں۔ آسمان پر بادل زور سے کڑکے۔ بارش ہونے لگی۔ ہوا بھی چلنے لگی۔ بارش اور ہوا میں باہر پھیلی ہوئی پیلی دُھند آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ آخرکار اِس دُھند کی آخری پرت بھی بارش اور ہوا کے ایک تیز جھونکے کے ساتھ کہیں غائب ہوگئی۔

● ● ●